



محمود، فاروق، فرزانه اور
انسپیکٹر جمشید سیریز
ناول نمبر 12



پراسرار پٹا



اشتیاق احمد

اتلانٹس پبلکیشنز صحت مند، اسلامی اور دلچسپ کتابوں اور اداروں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعہ اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول	پراسرار پٹائی
نمبر	انسپیکٹر جمشید سیریز نمبر 12
پبلشر	قاروق احمد
قیمت	35 روپے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اتلانٹس پبلکیشنز کی مثالی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل، کپی، ریکارڈنگ، یا کسی بھی شکل میں اور کسی بھی ذریعے سے ترسیل نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب اس شرط کے تحت فروخت کی گئی ہے کہ اس کا بغیر ناشر کی مثالی اجازت کے بطور تجارت یا بصورت دیگر مستعار دوبارہ فروخت نہیں کیا جائے گا۔

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی غلط و کمزوریت اور رابطے کیلئے معذرتیں پیش کر رہے ہیں۔

ایک حایت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
”مومن و مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے۔
جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط بناتا ہے۔“
پھر آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے
میں داخل کر کے بتایا کہ یوں!
☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ کچھ لیں کہ:

☆ بیعت مہارت کا تو نہیں۔

☆ آپ کی سکول یا کوئی کام تو نہیں کرتا۔

☆ آپ نے کسی کو وقت توڑے نہیں رکھا۔

☆ آپ کے اپنے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول انسانی میں رکھ دیں۔ پہلے مہارت اور

دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں۔ پھر ناول پڑھیں۔

اشتیاق احمد

جیب کٹ گئی

ایک موٹا تازہ آدمی مون لائٹ ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر قیمتی سوٹ تھا۔ انگلیوں میں بیروں کی انگوٹھیاں جھنگا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بھی باز صفا تھا۔ ایک میز پر بیٹھتے ہوئے وہ دھاڑا:

"ہیرا!" اس کی دھاڑ سے ہال کے سب لوگ اسے چونک کر دیکھنے لگے۔ دوسری میزوں کے ہیرے بھی گھبرا گئے۔

اس میز کا غریب ہیرا اس کی طرف دوڑا گیا:

"ہیس سر! ہیس سر!"

"تمہارا سر کھانا لاؤ۔ جلدی۔"

"کیا لاؤں سر۔"

"سب چیزیں لے آؤ۔"

"جی!" ہیرے کی آنکھیں حیرت سے اٹل پڑیں۔

"ہاں ہاں۔ جو جو چاہے، لے آؤ۔"

"اوکے سر!" ہیرے نے کہا اور ہانپتا کانپتا چلا گیا۔

دس منٹ بعد ہی اس کی میز کھانے کی پلیٹوں سے بھری گئی اور وہ مریضوں کی طرح کھانے لگا۔ کئی لوگ حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ کھانے سے فارغ

دوباتیں

استقام علیکم!

لہجے اب چٹائے بھی پراسرار ہونے لگے۔ مگر اب کیوں..... یہ تو پینتیس سال پرانے چٹائے ہیں..... اب ان میں چپ چپاتے اسرار شامل ہو گیا تو اس میں میرا کیا قصور..... اور پراسرار بھی اتنا ہی پرانا ہے.....

ویسے دیکھا جائے تو آپ یہ ناول پراسراریت ہی کے لئے پڑھتے ہوں گے..... اگر ان ناولوں میں اسرار نہ ہو تو پرانے میں اور عام ناولوں میں کیا فرق رہ جائے گا..... کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں..... آپ تو خیر فوراً کہہ دیں گے..... جی ہاں کل ٹھیک..... لیکن بھر حال کچھ لوگ ہیں..... جو پراسرار ناولوں سے چلتے ہیں..... جاسوسی ناول انہیں ایک آنکھ نہیں بھانتے..... ان کا خیال ہے..... جاسوسی ناول بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہوتے ہیں..... اور اچھا حال یہ ہے کہ جس چیز میں پراسراریت کے جراثیم نہ ہوں..... وہ آگے چلتی ہی نہیں..... پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، پراسراریت نہ ہو تو بس چند سطریں پڑھ کر براسمانہ بنا کر کتاب ایک طرف رکھ دیتا ہوں..... سچ بات یہ ہے یہ ناول پراسرار تھے..... عجیب تو مشہور ہوئے تھے..... اور اسی لئے تو آج ایک مدت بعد پھر سے ان کو شائع کیا جا رہا ہے..... ورنہ کون انہیں گھاس ڈالتا.....

لہجے آدو ہاتھیں پراسرار چٹائے سے گھاس تک آنکھیں..... جب کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں..... گھاس میں سرے سے پراسراریت نہیں ہوتی..... ہاں کوئی جاسوسی ناول نگار چاہے تو اس میں بھی اسرار پیدا کر دے..... جی ہاں اور کیا.....

سب سے

ہوا۔ اس نے بدتمیزی سے ٹپکین سے ہاتھ صاف کیے پھر لاپرواہی سے اٹھا اور واش ٹین کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے صابن سے ہاتھ دھوئے، منہ صاف کیا، واپس اپنا میز پر آیا۔ اور ایک بار پھر دباڑا:

"میرا"

"میسر۔" میرا قریب ہی موجود تھا۔ فوراً اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"بل لاؤ۔" اس نے کہا۔

میرا گیا اور بل لے آیا۔ اس نے ایک نظر بل پر ڈالی، جیب میں سے پرس نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا اور پھر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے کرسی میں کسی بچھو نے اسے کاٹ کھایا ہو جیسے کرسی میں یک لخت بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں پٹی پڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے صاحب!" میرے نے گھبرا کر پوچھا۔

"مم۔۔۔ میری۔۔۔ میری۔۔۔ جب کٹ گئی۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیا۔ جیب کٹ گئی۔" ہاں میں ہی آوازیں ابھریں۔

"ہاں۔ یہ دیکھو" اس نے کٹی ہوئی جیب الٹ کر دکھادی۔ اس کا ہاتھ کٹی ہوئی

جیب میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

"کیا آپ اس شہر میں اجنبی ہیں۔" میرے نے پوچھا۔

"ہاں۔ آج ہی آیا ہوں۔ میرا تو سامان بھی ابھی تک اسٹیشن پر ہی پڑا ہے۔"

"اور۔ کیا آپ نے اسٹیشن پر لکھا ہوا بورڈ نہیں پڑھا تھا۔"

میرے نے پوچھا۔

"کیسا بورڈ!" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"اور کیا آپ نے اس ہوٹل کے باہر لکھا ہوا بورڈ بھی نہیں پڑھا۔" اس مرتبہ

میرے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔ کیوں کیا بات ہے، ان بورڈوں پر کیا

"جناب۔ ان پر لکھا ہے کہ یہ اچکوں کا شہر ہے۔ اپنی جیب کی حفاظت کیجیے۔ اور اس ہوٹل کے بورڈ پر تو آگے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کھانے کے بعد آپ بل ادا نہ کر سکے (جیب کٹ جانے کی وجہ سے) تو بل آپ کی رسٹ وایج یا کوٹ اتار کر وصول کر لیا جائے گا۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" وہ پھر دباڑا۔

"جناب۔ یہ بکواس نہیں ہے۔ یہ شہر واقعی اچکوں کا ہے۔ یہاں کسی کی جیب محفوظ نہیں۔ اکثر یہاں آنے والے کا کپ جپ آتے ہیں تو ان کی جیب کٹ چکی ہوتی ہے۔ اب ہوٹل کہاں تک نقصان برداشت کر سکتا ہے۔ یہاں تو ایسے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔"

"ہوں۔ تو اب مجھے رسٹ وایج اتار کر دینی ہوگی۔" اس نے میرے کو گھورا۔

"مجبوری ہے جناب۔ رقم کی ادائیگی کے بعد آپ اپنی گھڑی واپس لے سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہوٹل کے مالک کو بلاؤ۔"

"وہ یہاں موجود نہیں ہوتے۔"

"اچھا تو منیجر کو بلاؤ۔"

"جی بہت بہتر۔"

میرا گیا اور منیجر کو بلا لایا۔ یہ ایک نو جوان اور مضبوط آدمی تھا۔

"تم اس ہوٹل کے منیجر ہو۔" نوجوان نے شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھوڑا۔

"جی ہاں۔ بد قسمتی سے۔" اس نے ہنسی صورت بنا کر کہا۔

"کیوں بد قسمتی سے کیوں؟" اجنبی مسکرایا۔ اس کا خاصا ایک دم غائب ہو گیا۔

"اچکوں کے شہر میں کسی ہوٹل کا منیجر ہونا بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جیب کٹ گئی ہے۔"

"ہاں۔ بد قسمتی سے۔" اس نے مسکرا کر کہا جس پر منیجر کو بھی ہنسی آ گئی۔

"کتنی رقم تھی۔"

"اڑھائی ہزار۔"

"اوہ۔ مجھے افسوس ہے۔"

"اب میری گھڑی اتروانا چاہتے ہیں۔"

"مجبوری ہے۔"

"لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے۔" اجنبی نے کہا۔

"وہ کیا۔" منیجر نے خوش اخلاق لہجے میں کہا۔

"میرا سامان اسٹیشن پر پڑا ہے۔ یہ اس کی رسید ہے۔"

اس نے بیرونی جیب سے رسید نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ تو پھر۔"

"آپ اپنے کسی آدمی کو بھیج کر یہ سامان منگوا لیں۔ وہ جیسی میں چلا جائے،

میں جیسی کا کرایہ بھی ادا کر دوں گا۔ اس میں میرے کچھ اور پیسے ہیں جن سے میں آپ

کا ٹیل ادا کر دوں گا۔"

"جی بہت بہتر۔ لائیے رسید۔ میں ابھی آپ کا سامان منگوائے دیتا ہوں۔"

"اور جب تک سامان نہیں آ جاتا، میں ضمانت کے طور پر بیٹھیں بیٹھا رہوں گا۔" اجنبی نے کہا۔

"جی شکریہ!" منیجر نے مسکرا کر کہا اور چلا گیا۔

آدھ گھنٹے بعد اس کا سامان لے آیا گیا اور پھر اس نے ٹیل ادا کیا۔

سامان بھی ہوٹل ہی میں جمع کر آیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ جانتے ہیں۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔" اس نے منیجر سے کہا۔

"جی ہاں آپ تھانے جا رہے ہوں گے۔" منیجر نے کہا۔

"تم نے ٹھیک سمجھا۔ اس کا مطلب ہے لوگ پہلے بھی تھانے جاتے رہتے

ہیں۔"

"جی ہاں۔ لیکن بننا کچھ نہیں۔ آج تک ایک بھی اچکا گرفتار نہیں ہو سکا۔"

"لیکن اب تم دیکھنا۔ اس شہر میں بھونچال آتا ہے کہ نہیں۔ پولیس بھاگی

بھاگی پھرتی ہے کہ نہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" منیجر نے چونک کر کہا۔

"بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔" اجنبی نے کہا اور ہوٹل سے نکل گیا۔

☆☆

دولت پور کے تھانے کا انچارج انسپکٹر ساجد دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے

بیٹھا تھا۔ ان دنوں اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جس

دن چدرہ میں لوگوں کی جینیں نہ کٹتی ہوں۔ وہ حیران تھا کہ یکا یک شہر میں اتنے اچکے

آکھیاں سے گئے۔ آج سے تین ماہ پہلے تو کبھی اس شہر میں کسی کی جیب نہیں کٹی تھی۔

کبھی کبھار چوری یا ڈاکے کا کیس ہو جاتا تھا۔ ایک دو کیس لڑائی جھگڑوں کے بھی

ہوئے تھے۔ لیکن جیب کٹنے کے یہ کیس بالکل نئی چیز تھے۔

دولت پورا ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا۔ جدید طرز پر بنایا گیا تھا۔ یہاں نئی طرز کے صاف ستھرے مکان ہوئے اور سڑکیں کشادہ تھیں۔ رات کے وقت شہر رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگ کرتا۔ اس چھوٹے سے شہر میں انسپکٹر ساجد کی تعیناتی کو چھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن ان چھ سالوں میں مشکل ترین وقت اب آیا تھا۔ شہر میں جیب کتروں نے اودھم مچایا ہوا تھا اور ہزاروں کوشش کے باوجود بھی وہ ایک جیب کترے کو بھی گرفتار نہیں کر سکا تھا۔ یہی بات اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ یہ کیسے اچکے ہیں۔

آج بھی صبح سے نو آدمی رپورٹ درج کرانے آچکے تھے۔ ابھی ابھی وہ نوویں آدمی کی رپورٹ لکھ کر اور اسے دم دلا سادے کر دھست کر کے قاریغ ہوا تھا اور سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد کی وجہ سے دھک سی ہو رہی تھی کہ اسی وقت اجنبی اندر داخل ہوا:

"السلام وعلیکم"

"وعلیکم السلام! فرمائیے۔" انسپکٹر ساجد نے چونک کر کہا۔

"آپ ہی انسپکٹر ساجد ہیں۔"

"جی ہاں۔ بد قسمتی سے۔"

"بد قسمتی سے۔ کمال ہے۔ اس شہر میں جو بھی ملتا ہے یہی کہتا ہے۔" اجنبی نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں نے مون لائٹ ہوئے کے منبر سے یہ سوال

کیا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ جی ہاں بد قسمتی سے۔"

"اوہ۔ سمجھا۔ خیر آپ فرمائیے کیسے تشریف لائے۔"

"میری جیب کت گئی ہے۔"

"جی!" انسپکٹر ساجد چلا اٹھا۔ "آف خدا۔ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اجنبی سے پوچھا

"کیا عرض کروں۔ اس شہر میں نہ جانے کہاں سے اتنے اچکے آگئے ہیں۔ خیر آپ رپورٹ لکھوائیے۔"

"لیکن رپورٹ لکھنے سے پہلے کیا بتانا ہے جواب بن سکے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ شاید ہوئے کے منبر نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"جی ہاں۔ سب کچھ۔"

"پھر بھی۔ رپورٹ تو آپ کو لکھوانی ہی پڑے گی۔"

"اچھا لکھئے۔" اجنبی نے کہا۔

"آپ کا نام۔" ساجد نے پوچھا۔

"پرویز اختر۔"

"باپ کا نام؟"

"اختر اعجاز۔"

"جی۔" انسپکٹر ساجد چونکا۔ کیونکہ یہ نام اُس کے ایس ایس پی صاحب کا

تھا۔

"آپ چونک کیوں گئے۔ میں اس ضلع کے ایس ایس پی کا لڑکا ہوں۔"

انسپکٹر ساجد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی اس

کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

"آپ لکھتے لکھتے رک کیوں گئے۔" پرویز اختر نے پوچھا۔

"آپ کب آئے۔ اور سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آئے۔ ہوٹل جانے کی کیا ضرورت تھی۔" آخر ساجد نے منہ پھلے ہوئے کہا۔

"ابا جان کی ہدایت تو یہی تھی کہ میں آپ کے پاس ٹھہروں۔ خود میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں، پہلے میں ہوٹل چلا گیا۔ دراصل بھوک بہت لگ رہی تھی۔"

"اب میں آپ سے گزارش کروں گا۔" انسپکٹر ساجد نے کہا۔

"فرمائیے۔" پرویز اختر مسکرایا۔

"اپنی جیب کتنے کی اطلاع انہیں نہ دیجئے گا۔"

"مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے۔ ابا جان نے بھی کہا تھا کہ آپ بہت فرض شناس ہیں۔ مگر میں حیران ہوں کہ یہاں اتنے اچکے کہاں سے آ گئے۔"

"میں خود حیران ہوں۔ اس سے پہلے تو کبھی لوگوں کی جیب نہیں کٹی تھیں۔"

"پھر..... اب آپ کہا کریں گے۔"

"کیا بتاؤں۔ یہی سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ یہ شہر تفریحی مقام بھی ہے۔ یہاں مال دار لوگ تفریح کے لیے آتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچ کر کوئی جیب کسٹروں کا گردہ یہاں آ گیا ہو....."

"ہاں۔ یہ ممکن ہے۔"

"میرے پاس یہاں اتنی پولیس بھی نہیں ہے کہ جگہ جگہ پہرے بٹھا دوں۔"

"ہوں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

"اب تو میں یہی سوچ رہا ہوں کہ اپنے دوست کو مدد کے لیے بلا لوں۔"

انسپکٹر ساجد نے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"انسپکٹر جمشید۔"

"انسپکٹر جمشید۔ یہ نام تو سنا ہوا ہے۔"

"جی ہاں۔ دارالحکومت میں محکمہ سرانفرسانی کے انسپکٹر جمشید سے کون واقف نہیں ہوگا۔"

"اوہ۔ اب میں سمجھا۔ بھی ان کے تین بچوں کے نام بھی اکثر سننے میں آتے رہتے ہیں۔"

"بس بس۔ وہی۔"

"وہ آپ کا دوست ہے۔"

"جی ہاں۔"

"کیا وہ ان اچکوں کو پکڑ سکے گا۔"

"وہ بہت باصلاحیت آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔"

"تو پھر اسے بلا کر دیکھ لیں۔"

"جی ہاں۔ میں ابھی اسے تار دیتا ہوں۔" انسپکٹر ساجد نے کہا اور تار کھینچنے لگا۔

☆☆☆

نوک جھونک

محمود اور فاروق گھر میں داخل ہوئے۔ فرزانہ اور بیگم جمشید صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ بیگم جمشید کوئی سوئٹر بن رہی تھیں جب کہ فرزانہ کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ محمود نے فاروق کے کان میں سرگوشی کی:

"فرزانہ اس وقت ضرور کوئی ناول پڑھ رہی ہے۔"

"شاید تمہارا خیال ٹھیک ہی ہے۔"

"تو کیوں نہ چھاپہ مارا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔"

دونوں دبے پاؤں آگے بڑھے اس طرح کہ ان دونوں کو پتا نہ چلا اور وہ فرزانہ کے سر پر پہنچ گئے۔ پھر اچانک محمود جھکا اور فرزانہ کے ہاتھ میں سے ناول بھٹ لیا۔

"ارے! یہ کیا۔ ہائیں تم دونوں کیسے اندر آ گئے شاید دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

ساتھ ہی وہ اٹھی اور محمود کی طرف جھپٹی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محمود کے ناول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا، لیکن محمود نے ایک دم ہاتھ اوپر کر لیا۔ فرزانہ چونکہ قد میں اس سے چھوٹی تھی اس لیے اس کا ہاتھ محمود کے ہاتھ تک نہ پہنچ سکا، وہ بچوں کے بل کئی

بارا چلی گھر ناول تک نہ پہنچ سکی کیونکہ ساتھ ہی محمود بھی اچھل رہا تھا۔

"یہ کیا۔ تم دونوں نے آتے ہی اودھم مچا دیا۔"

"ای جان! یہ دیکھئے فرزانہ ناول پڑھ رہی تھی۔ یہ ہا....."

"تو کیا ہوا۔ ان دونوں تم لوگ فارغ ہو۔ جو جی چاہے کرو۔ بچوں کے ناول

پڑھنے میں کیا حرج ہے، بشرطیکہ اسکول کا کام کیا جا چکا ہو۔"

"تو گویا۔ آپ ہمیں کھلی اجازت دے رہی ہیں۔" فاروق بولا۔

"ہاں ہاں۔ تم تینوں ان دونوں فارغ ہونا۔"

"فاروق! ذرا کمرے سے دونوں ناول تو نکال لاؤ۔ ہم دونوں بھی یہیں بیٹھ

کر پڑھیں گے۔" محمود نے کہا۔

"دیکھا امی جان۔ خود یہ دونوں بھی مجھے رستم ہیں۔ ان کے کمرے میں بھی

ناول موجود ہیں۔" فرزانہ نے جلتے جلتے انداز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" بیگم جمشید مسکرائیں۔

ان کے سالانہ امتحان ہو چکے تھے۔ رزلٹ ابھی نہیں لکھا تھا۔ اس لیے آج کل

انہیں اسکول سے چھٹیاں تھیں۔ وہ دونوں ابھی ابھی اپنے کسی دوست کے ہاں سے

آ رہے تھے کہ آتے ہی فرزانہ سے جھڑپ ہو گئی۔

"اُپکچے ہو پورے۔" فرزانہ نے محمود کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے اُپکا کہا تو ناول نہیں ملے گا۔" محمود نے دھمکی دی۔

"نہ ملے۔ میں پڑھ چکی ہوں۔" فرزانہ نے بے نیازی سے کہا۔

"اس لیے تم اُپکچے ہی ہو۔"

"اور میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"تم بھی اس کے بھائی ہو۔"

"اور تم ہم دونوں کی بہن۔ یعنی آپکی۔" فاروق کی بات پر محمود اور بیگم جشید کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"لیکن۔ چھوٹی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اچھا یہ لو اپنا ناول۔ ہمارے پاس اپنے موجود ہیں۔" محمود نے یہ کہہ کر ناول اونچا اچھا لے دیا۔ فرزانہ اسے دبوچنے کے لیے لپکی لیکن اس سے پہلے فاروق ناول کو دبوچ چکا تھا۔

"دیکھا امی۔ دونوں مجھے تنگ کرنے پر تلے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ کل تم تل جانا۔" فاروق نے ترے کہا۔

"ہاں۔ تم بھی تو شیطان کی خالہ ہو۔ ہمیشہ ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھتی ہو۔" محمود بولا۔

"بھئی محمود۔ اب اسے زیادہ نہیں ستانا چاہیے۔ میں ناول اسے واپس دے رہا ہوں۔" فاروق نے شریر لہجہ میں کہا۔

"لیکن ایک شرط پر۔" محمود بولا۔

"وہ کیا۔" فاروق سے پوچھا۔

"یہ آئندہ ہمارے کسی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گی۔"

"کیوں فرزانہ۔ تمہیں یہ شرط منظور ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل منظور ہے۔" فرزانہ نے جمل بھن کر کہا۔

فاروق نے یہ سن کر ناول اسے پکڑا دیا۔ فرزانہ نے ناول لیا درمیان سے اسے کھولا اور پڑھنے لگی۔

"ارے! تم تو کہتی تھیں کہ پڑھ چکی ہو۔"

"تم سے ناول واپس لینے کے لیے یہ کہنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ تم دونوں بھی

نہ دیتے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"ہوں۔ تو ایک بار پھر تم ہمیں چکمر دے گئیں۔" محمود نے گھر کر کہا۔

"اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں تمہارے معاملات میں آئندہ ٹانگ بے شک

نہیں اڑاؤں گی کیونکہ وعدہ کر چکی ہوں۔ لیکن؟"

"لیکن کیا؟" دونوں ایک ساتھ جھنجھلا کر بولے۔

"اب میں تمہارے معاملات میں ہمیشہ پیرا اڑا دیا کروں گی۔"

فرزانہ نے مصحوبیت سے کہا اور بیگم جشید کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

دونوں اسے مارنے کی لیے جھپٹے۔ عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

"یہ دو پہر کو کون آگیا۔" بیگم جشید اپنی ہنسی روک کر بولیں۔

"میں دیکھتا ہوں امی۔" محمود نے کہا۔

"بیٹا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے معلوم کر لینا کہ کون ہے۔"

"جی اچھا۔" محمود نے کہا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ انسپکٹر جشید کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

"آپ۔ اس وقت، خیر نو ہے۔" بیگم جشید گھبرا گئیں۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ میں ذرا دولت پور جا رہا ہوں۔"

"دولت پور۔ کیوں کیا بات ہے۔۔۔ ساجد تو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"یوں تو وہ ٹھیک ہی ہے لیکن آج کل بہت پریشان ہے۔"

انسپکٹر جشید نے بتایا۔

"انکل ساجد کو کیا پریشانی آ پڑی ابا جان۔" محمود بولا۔

"دولت پور میں آج کل اچکوں نے اودھم مچایا ہوا ہے۔ ہر روز دس بارہ

آدمیوں کی جیبیں شارع عام پر کٹ جاتی ہیں اور ساجد آج تک کسی کو پکڑ نہیں سکا۔

مجبور ہو کر اس نے مجھے بلایا ہے۔ آخر میں اس کا دوست ہوں نا۔"

"ہاں۔ آپ کو فوراً جانا چاہئے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"تم میرے کپڑے تیار کرو۔ میں دو گھنٹے بعد جانے والی گاڑی سے جا رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" بیگم جمشید نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

بتیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کئے پھر حمود اور فاروق نے فرزانہ کو کوئی اشارہ کیا:

"ابا جان۔ ہم بھی تو آج کل فارغ ہیں۔"

"میں جانتا ہوں بیٹی۔ پھر تم نے یہ بات کیوں کہی۔"

"ہمیں بھی دولت پور ساتھ لے چلیں۔ سنا ہے بہت خوبصورت شہر ہے۔"

فرزانہ نے کہا۔

"اور تفریحی مقام بھی ہے۔" فاروق بول اٹھا۔

"لیکن میں تو وہاں اچکوں میں البھار ہوں گا۔ تم لوگوں کو تفریح کیسے کرا سکوں

گا۔" انسپکٹر جمشید نے اعتراض کیا۔

"ہم بھی اچکوں کو پکڑنے میں آپ کی مدد کریں گے۔ اور تفریح کا کیا ہے، وہ

تو ہم خود ہی کر لیں گے۔"

"اور یہاں تنہا رہی امی جو تنہا پریشان ہوں گی۔" انسپکٹر جمشید نے اعتراض کیا۔

"تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں۔"

"تم بتیوں تک بہت کرتے ہو۔" انسپکٹر جمشید انھج سے گئے۔

"اگر آپ کا یہی خیال ہے تو ہم نہیں جاتے۔" فاروق نے مسکری صورت بنا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید ہنس پڑے۔ بولے:

"میں جانتا تھا تم بھی ساتھ چلنے کے لیے ضد کرو گے۔"

"آپ جانتے تھے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ میں تو یہاں تک جانتا ہوں کہ تم بتیوں نے پہلے اشاروں ہی اشاروں

میں بات کی پھر فرزانہ کو بات شروع کرنے کا اشارہ کیا۔"

"ارے! آپ کو اس کا بھی پتا چل گیا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔ بتیوں

ی حیران تھے۔

"ہاں۔ حیران بعد میں ہو لینا پہلے جا کر اپنی امی کو کہو۔ ہم سب چل رہے ہیں۔"

"ابا جان۔" محمود نے اونچی آواز میں کہا۔

"زندہ باد۔" دونوں نے چلا کر کہا اور انسپکٹر جمشید ہنس پڑے۔

بیگم جمشید گھبرا کر باہر نکل آئیں اور بولیں:

"میں نے ابھی ابھی کچھ نعروں کی آوازیں سنی تھیں۔ کیا کوئی جلوس گزرا ہے۔"

"جی ابھی گزرا نہیں۔ گزرے گا۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" بیگم جمشید چونکیں۔

"ہم پانچوں کا جلوس انٹینشن کی طرف روانہ ہوگا۔"

"کیا۔؟"

"جی ہاں۔ امی۔ ہم سب دولت پور چل رہے ہیں۔"

"ارے! یہ اتنی جلدی پروگرام میں تبدیلی کیسے آگئی۔"

"یہ ان بتیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ سمجھی۔"

"اب سمجھ بعد میں لینا۔ چلنے کی تیاری کرو۔"

"اچھا۔"

انسپکٹر جمشید کی مہارت

سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں زیادہ درش نہیں تھا۔ بچوں نے کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا پروگرام بنایا تاکہ باہر کے مناظر دیکھ سکیں۔ بیگم جمشید ان کے ساتھ ہی تھیں، البتہ انسپکٹر جمشید ان کے سامنے والی برتھ پر تھپا بیٹھے تھے۔ جوئی گاڑی اسٹارٹ ہوئی، شریفانہ کپڑوں میں بیویوں ایک نوجوان اندر آیا اور انسپکٹر جمشید کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ادھر ادھر کوئی مناسب جگہ دیکھی تھی۔ لیکن دوسری برتھوں پر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی بیٹھی تھیں اس لیے وہ انسپکٹر جمشید کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ انہوں نے اس پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی۔ انہیں چاہتے تھے کہ وہ صرف وہ گئے۔

"اگر میں سگریٹ پیوں تو آپ کو اعتراض نہ نہیں ہوگا۔" سرفار نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ شوق سے پی سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔

"شکریہ! اس نے کہا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگا۔

"اے! شریفانہ! اس نے گھڑی دہ گیا۔ آپ کے پاس لائسنس یا پاس ہوگا۔"

اس نے پھر انسپکٹر جمشید سے کہا۔

"جی نہیں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اے! شریفانہ! اس نے گھڑی دہ گیا۔ آپ کے پاس لائسنس یا پاس ہوگا۔"

"شکریہ۔" اس نے سگریٹ سلکانے کے بعد ماچس واپس کرتے ہوئے

کہا۔ پھر انسپکٹر جمشید سے بولا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"دولت پور۔"

"جی۔ کیا کہا۔ دولت پور۔"

"ہاں۔ کیوں، آپ دولت پور کے نام پر چوکنے کیوں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ بھی دولت پور کا نام سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میں دولت پور کا ہی رہنے والا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ چوکنے کیوں تھے۔" انہوں نے پھر پوچھا۔

"ان دنوں لوگ دولت پور جانے سے گھبراتے ہیں۔ کیا آپ میرے کرنے کی

غرض سے جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"تو پھر میرا مشورہ ہے کہ نہ ہی جائیں۔"

"کیوں؟"

"آج کل دولت پور اچکوں کا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ وہاں اچکوں کا راج

ہے۔ کسی کی جیب محفوظ نہیں۔"

"لو... خیر کوئی بات نہیں۔ ہم گھر سے زیادہ پیسے لے کر نکلا ہی نہیں کریں

گے۔"

"آپ کی مرضی۔" مسافر نے واپس ہو کر کہا۔

"دراصل مجھے وہاں ایک کام بھی ہے۔"

"ہوں۔" اس نے صرف اتنا کہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار پر

نظریں جھاویں۔

"اباجان! ہم دولت پور کتنے بچے پہنچ جائیں گے۔"

"بیٹے ٹہکی کوئی تین بچے....."

"آپ کا دولت پور میں کیا کاروبار ہے۔" اچانک انسپکٹر جمشید نے اس مسافر سے سوال کیا۔

"جی..... جی میں تجارت کرتا ہوں۔"

"بہت خوب..... کس چیز کی تجارت۔"

"ڈبل روٹی کی....."

"کیا نام ہے آپ کا....."

"جی..... مجھے سلطان کہتے ہیں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ حیران تھے کہ ان کے والد اس مسافر سے اس قسم کے سوالیہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ یہ ان کی عادت کے خلاف تھا۔ جو نئی گاڑی دولت پور کے اسٹیشن پر رکھنے لگی، وہ مسافرا اٹھا اور جیزی سے ریختی گاڑی سے اتر گیا۔ انسپکٹر جمشید مسکرا کر اترنے دیکھتے رہے پھر بولے:

"بے وقوف!"

"ہم تینوں میں سے کون بے وقوف ہے اباجان!" فرزانہ نے پوچھا۔

"اباجان نے تمہیں ہی تو کہا ہے۔" فاروق بول اٹھا۔

"کیوں..... میں نے کیا کیا ہے۔"

"کیا تو ہم دونوں نے بھی کچھ نہیں۔" محمود نے مصوحت سے کہا۔

"اڑتے کیوں ہو۔ میں نے تم تینوں میں سے کسی کو بے وقوف نہیں کہا۔"

انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر.....؟" ان تینوں نے ایک ساتھ کہا۔ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

ساتھ ہی تینوں نے ایک ساتھ اپنی امی کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تو پھر کیا امی جان کو بے وقوف کہا ہے۔ بیگم جمشید نے ان کی نظروں کا مطلب پھانپتے ہوئے کہا۔

"بدتمیز ہوتی..... بھلا یہ مجھے بے وقوف کیوں کہتے۔"

"لیکن امی..... ہم نے تو ایسا نہیں کہا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"بھئی..... دراصل میں نے اُسے بے وقوف کہا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"کے؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"اس مسافر کو۔ جو میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور جو ابھی ابھی اتر کر گیا ہے

حالانکہ ابھی گاڑی پوری طرح رکی بھی نہیں ہے۔"

"اوہ۔ اب ہم سمجھے۔ واقعی۔ چلتی گاڑی سے اترنا بے وقوف نہیں تو اور کیا

ہے۔" محمود بولا۔

"لیکن میں نے اسے اس وجہ سے بے وقوف نہیں کہا۔"

"تو پھر؟" فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ سمجھتا ہے کہ میرا ہونہ اڑا کر لے جا رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا؟" تینوں چلائے۔ بیگم جمشید بھی حیران رہ گئیں۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے میرا ہونہ میری جیب سے نکال لیا تھا۔"

"حیرت ہے۔ بہت ماہر ہیں یہ لوگ۔" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

"ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔"

"تو آپ؟" اُسے پکڑا کیوں نہیں۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"پکڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھئی ہم انہیں کو پکڑنے تو آتے ہیں۔

ان سب کو پکڑنا ہے۔ کسی ایک کو پکڑ کر ہوشیار کرنے سے کیا فائدہ۔"

"تو آپ نے اپنا ہنر واپس کیسے حاصل کر لیا۔"

"میں بھی اس فن میں ماہر ہوں۔ جب اس نے میرا ہنر نکالا تو مجھے پتا چل گیا۔ لیکن انجان بن کر بیٹھا رہا۔ پھر جب وہ سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے اپنا ہنر اس صفائی سے نکالا کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی۔ اب وہ اسٹیشن سے باہر جا کر جیب ٹولے کا توہکا بنا کر رہ جائے گا۔"

"حیرت ہے۔" محمود بولا۔

"اب تمہیں کس بات پر حیرت ہو رہی ہے۔"

"ابا جان کی مہارت پر۔"

"ارے بھئی کیا گاڑی میں اسی بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔" آخر انسپکٹر جمشید نے انہیں یاد دلایا کہ انہیں تو اتنا بھی ہے۔

☆☆☆

خالی پرس

پلیٹ فارم پر انہیں انسپکٹر ساجد کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔

"کیا آپ نے انگل ساجد کو اطلاع نہیں دی تھی۔" محمود نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولے۔

"کیوں؟"

"ہم اس کے ہاں نہیں ٹھہریں گے۔"

"وہ کیوں۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"اگر اس کے ہاں ٹھہرے تو جیب کتروں کو نہیں پکڑ سکیں گے۔"

"تو پھر۔"

"ہم ہوٹل مون لائٹ میں ٹھہریں گے سنا ہے کہ وہ یہاں کا سب سے اچھا

ہوٹل ہے۔"

"تو چلے پھر....." ایک قلی نے ان کا سامان اٹھایا، وہ اسٹیشن سے باہر آنے لگا

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے اور وہ چاروں بھولی سیٹ پر تھے۔ ٹیکسی

تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ اچانک ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا۔ وہ مسنبھل نہ سکے۔

ایک طرف کو جھکتے چلے گئے۔ انسپکٹر جمشید بھی چونک کر بے خبر تھے اس لیے ڈرائیور پر لد

پڑے۔ سوز کاٹنے کے بعد جب ٹیکسی سیدھی دوڑنے لگی تو انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا، ان کی جیب ہلکی ہو چکی ہے۔ وہ حیران رہ گئے۔ یہ انسپکٹر جمشید تھے جنہوں نے جیب کے ہلکے بین کو محسوس کر لیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔ انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

"ڈرائیور صاحب۔ ڈرا گاڑی روکنا۔"

"شاید ہمیں اسٹیشن واپس جانا پڑے۔ تم گاڑی روک لو۔ میں ایک منٹ کے لیے سوچتا چاہتا ہوں۔ شاید ہم ایک ایچی کیس پلیٹ فارم پر ہی بھول آئے ہیں۔"

"اوہ!" ڈرائیور کے منہ سے نکلا اور اس نے ٹیکسی کو بریک لگائے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا کیونکہ وہ گھر سے ایک ہی سوٹ کیس لے کر چلے تھے۔

عین اسی وقت فرزانہ نے اس کے پیروں پر جھڑک کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ضرور کوئی بات ہے جس کی وجہ سے ان کے والد ٹیکسی روکار ہے ہیں۔ اب وہ اتنے جھگڑا بھی نہیں تھے کہ انہیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ گھر سے کیا کچھ لے کر چلے تھے۔

ٹیکسی رکتے ہی انسپکٹر جمشید نے جیب سے پستول نکال لیا اور ڈرائیور کے سینے پر رکھتے ہوئے بولے۔

"میرا بیٹو نکالو۔"

"کیا!" ان کے منہ سے حیرت کی زبانتی سے نکلا۔ ڈرائیور بھی چکا بکا رہ گیا۔

اس سے کوئی بات بن نہ پڑی۔ سہاگت و جاہر بیٹھارہ گیا۔

"تم نے پرس نہیں نکالا۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

ڈرائیور نے چٹون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ان کا بیٹو نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے بیٹو لیا، اپنی جیب میں رکھ کر مسکرا کر بولے:

"ٹیکسی تمہاری اپنی ہے۔"

"ہاں۔" ڈرائیور نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"محمود۔ ٹیکسی کے نمبر نوٹ کرو۔" انہوں نے محمود سے کہا۔

"جی بہتر۔" محمود نے کہا اور نمبر نوٹ کرنے کے لیے نیچے اتر گیا۔

"لائسنس دکھاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اس نے لائسنس نکال کر ان کو تھا دیا۔

"محمود! اس کا نام بھی نوٹ کرو۔۔۔ عرفان۔۔۔۔۔"

"جی۔ کر لیا۔۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم مون لائٹ چلو اور یہ بات یاد رکھو کہ یہ پستول میری جیب میں ہوتے ہوئے بھی تمہاری طرف اٹھا رہے گا۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو خود ڈے دار ہو گئے۔"

ٹیکسی ایک بار پھر چل پڑی۔ پھر وہ مون لائٹ ہوئی کے سامنے اترے۔ انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور ڈرائیور سے مسکرا کر بولے۔

"اب تم جاسکتے ہو۔"

وہ چند لمبے حیران حیران نگاہوں سے انہیں گھورتا رہا پھر ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ وہ ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھتے۔ ان کی نظریں ایک بورڈ پر پڑیں۔ اس پر سونے سونے سفید حروف میں لکھا تھا:

فیر وار! اس ہوٹل میں آنے سے پہلے اپنی جیب نڈل لیں۔ اگر کھانا کھانے کے بعد بل ادا نہ کر سکے تو بل آپ کے کوٹ یا رسٹ وائچ کی صورت میں وصول کر دیا جائے گا۔ اس شہر میں اچکوں کی حکومت ہے۔ کسی کی جیب محفوظ نہیں۔ جبے کن جانے کی صورت میں ہوٹل ڈے دار نہیں ہوگا۔

وہ اس بورڈ کو پڑھ کر حیران بھی ہوئے اور غصے بھی۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر انشپکٹر جمشید نے کہا:

"ہمیں ایک ڈبل روم چاہئے۔"

"جی۔ ڈبل روم تو مل جائے گا۔ کیا آپ اپنی جیب کا جائزہ لے چکے ہیں۔"

کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میرا بٹوہ محفوظ ہے۔"

"تجربہ ہے۔ آپ بٹوہ کیسے بچالائے۔"

"بہن۔ اسے اتفاق کہہ لیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اس رجسٹر میں اپنا نام۔ پتہ درج کر دیں۔ اور تین دن کا ایڈوانس کرایہ ادا کر دیں۔"

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک دیر سے ان کا سامان اٹھایا اور ان کے کمرے تک رہنمائی کی۔ کمرہ بہت خوبصورت اور بہترین قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھے۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ جب ضرورت ہوگی، بلا لیں گے۔" انشپکٹر جمشید دیر سے بولے۔

"اوکے سر! پیرا چلا گیا۔"

"محمود۔ دروازہ اندر سے بند کر لو۔" انہوں نے دیر سے کہتے ہی کہا۔

"کیوں ابا جان۔ کیا جیب کترے کمرے سے باہر کھڑے کھڑے بھی جیب

کاٹ سکتے ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔" انشپکٹر جمشید نے۔ "دراصل میں تم تینوں کو کچھ ہدایات

دی جا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جیب کتر اور وائے کے پاس کھڑا ہو کر سن لے۔"

محمود دروازہ بند کر چکا تو وہ بولے: "تمہارے بٹوں میں جتنے پیسے ہیں۔ انہیں نکال کر سوٹ کیس میں رکھ دو۔ بس چند روپے رہنے دو۔ یہ اچکے تو ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہیں۔"

"ابا جان۔ یہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔"

"بہت خوب۔ اب تم بٹوں کی حفاظت نہ کرنا۔۔۔ اور ٹیکس! تمہارے پرس میں تو کوئی نقدی یا زیور وغیرہ نہیں ہے۔"

"نقدی تو نہیں ہے۔ کیونکہ آپ دیتے ہی نہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ "البتہ زیور ضرور ہیں۔"

"کیا غضب کرتی ہو۔ کہاں ہے پرس؟"

"یہ رہا۔ میز پر۔"

"اسے کھول کر دیکھو۔ کیا زیور اس میں موجود ہے۔"

"اگر نہ بھی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیوں۔ فرق کیوں نہیں پڑتا۔"

"اس لیے کہ میں گھر سے نقلی زیور لے کر آئی ہوں۔"

تینوں اپنی اپنی عقل مندی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بہت خوب۔ ویسے تم دیکھو تو سکی۔ کیا زیور موجود ہے۔۔۔۔"

"موجود کیوں نہیں ہوگا۔ پرس تو میرے ہاتھ میں ہی رہا ہے۔"

"اوہ وہ دیکھ تو لو۔۔۔۔۔"

ٹیکس جمشید نے آنکھ کر پرس کھولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئیں۔ ان کے منہ سے نکلا "ارے ایہ تو خالی ہے۔"

"جی کہ میں جیب کتروں کو پکڑ پکڑ کر چھوڑ کیوں رہا ہوں۔"
 "آخر آپ ایسا کس لیے کر رہے ہیں۔" فاروق نے اُلجھ کر پوچھا۔
 "سوچو۔ ذہن پر زور دو۔"

تینوں سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر فرزانہ نے سر اٹھایا اور بول:
 "ابا جان میں سمجھ گئی۔"

"لو بھئی فاروق..... فرزانہ کا ذہن تو چل نکلا۔" محمود ہنسا۔

"میں جانتی ہوں۔ تم مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں پاگل کہہ رہے ہو۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"نہیں تو..... محمود نے تو تہماری تعریف کی ہے۔" فاروق شریعہ انداز میں

بول۔

"بھئی پہلے سن تو لو۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔" بیگم جمشید نے اسے تھلا کر کہا۔

"اچھا اسی جان۔ ہاں تو فرزانہ بتاؤ۔ تم کیا سمجھ گئیں۔"

"آپ جیب کتروں کو پکچان رہے ہیں۔" فرزانہ نے بتایا۔

"کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"مطلب یہ کہ ابا جان یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس شہر میں کون کون جیب کترا

ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک سمجھیں فرزانہ۔" انسپکٹر جمشید نے تعریف کی۔

"شکر یہ ابا جان....."

"اچھا اب یہ بتاؤ تم تینوں کے ہنڈوں کی کیا کیفیت ہے۔"

"ابا جان۔ ان تینوں میں جیب کتروں کے لیے تین پیٹام ہیں....."

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔ کیونکہ انہیں ان تینوں کے اس پروگرام

شک کی زد میں

اگلی صبح وہ ہوٹل کے ہال میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ بیگم جمشید کے ہاتھ میں ان کا پرس موجود تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی جیبوں میں اپنے اپنے ہنڈے تھے۔ انسپکٹر جمشید کی جیب میں بھی پھولا ہوا ہنڈہ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے ابھی تک انسپکٹر ساجد کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ اپنے ہنڈے میں کچھ زیادہ ہی نوٹ بھرا لائے ہیں۔" محمود نے ان کی جیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں چاہتا ہوں کہ کوئی جیب کترا جلد ہی اس پر ہاتھ ڈال دے۔"

"لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"کیوں فائدہ کیوں نہیں ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کسی کو پکڑتے تو ہیں نہیں۔ گاڑی میں ایک جیب کترے سے ملاقات

ہوئی، اسے چھوڑ دیا، پھر ٹیکسی ڈرائیور جیب کترا ثابت ہوا، اسے بھی پولیس کے

حوالے نہیں کیا۔ اب اگر کسی نے پھر آپ کی جیب پر ہاتھ ڈالا تو آپ اسے بھی

چھوڑ دیں گے۔" محمود نے کہا۔

"میں تو بات تم سمجھ نہیں۔"

"کیا بات۔"

کا کوئی علم نہیں تھا۔

"ہم نے رات ایک ایک سادہ کافٹر پر جیب کتروں کے نام پیغام لکھ کر اپنے اپنے بٹوے میں رکھ لیے ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جیب کتروں کے آئیں اور تینوں بٹووں کو اڑالے جائیں۔"

"اور بیگم۔ کیا تم بھی اپنے پرس میں کچھ رکھ کر لائی ہو۔"

"مجھے تو پہلے ہی اپنے زیور کے گم ہونے کا افسوس ہے۔" بیگم جمشید نے نرا سامنا بیٹایا۔

"کیدوں کیوں۔ دو تو نقلی تھا۔"

"ہاں۔ تھا تو نقلی ہی لیکن پورے چند روپے کا تھا۔"

"صرف ایک انسپکٹر جمشید فیس۔"

"معلوم ہوتا ہے۔ آج جیب کتروں سے سو گئے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"آخر وہ بھی انسان ہیں۔ انہیں بھی غیبت آتی ہوگی۔" فرزانہ نے اس کا مذاق اڑایا۔

"ہاں۔ رات کو تو انہیں سونا نصیب ہوتا نہیں۔" فاروق نے جواب میں کہا۔

اچانک ہوٹل کے ہال میں بیرونی دروازے سے ایک ملی اندر داخل ہوئی۔

فورا بعد ہی ایک سیاہ رنگ کا ٹوٹا کتنا بھی اس کے پیچھے بچھتا ہوا داخل ہوا۔ بس پھر

کیا تھا۔ سارے ہال میں کھلبلی مچ گئی۔ ملی آگے آگے تھی اور کتنا پیچھے پیچھے۔ سارے

ہال میں چکراتے پھر رہے تھے۔ اور لوگ ان سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے

تھے۔ انسپکٹر جمشید، بیگم جمشید اور تینوں بچے بھی ہڑ بولنگ کی زد سے بچ نہ سکے۔ اس

دوران میں ان سے کئی آدمی بھاگے۔

آخر ہوٹل کے دو تین ہیرے کھنکھ سے ڈنڈے لے آئے اور انہوں نے بار بار

کردوٹوں کو ہوٹل سے باہر نکال دیا۔

ہوٹل کے ہال میں ماحول پر سکون ہونے میں چند منٹ لگے۔ لیکن یہ سکون چند منٹ بھی برقرار نہ رہا۔ کئی لوگ بول اٹھے۔

"ارے! ہیرا ہڈو! "ارے! میں لٹ گیا....." "میری جیب کٹ گئی۔" انہوں نے چونک کر اپنی اپنی جیب کی طرف دیکھا تینوں بچوں کے منہ سے حیرت کے باعث کھلے کھلے رہ گئے۔

"ابا جان۔ ہم تینوں کے بٹوے غائب ہیں۔" محمود نے بولکھلا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو کیا۔ آپ کا بٹوہ بھی۔" فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

"نہیں۔ وہ محفوظ ہے۔ دراصل ملی اور کتے کے اندر داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا

کہ اب لوگوں کے بٹووں کی خیر نہیں۔ اس لیے میں نے اپنے بٹوے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔"

"تو کیا آپ کی جیب پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈالا کیوں نہیں۔ لیکن اس کا ہاتھ میری جیب کی بجائے میرے ہاتھ سے

نکرا رہا تھا۔ یہ دیکھو۔"

انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں کہ ان کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

"ارے! یہ کیا ہوا۔" بیگم جمشید اور تینوں بچے گھبرا گئے۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ شاید جیب کتروں کا بلیڈ لگ گیا ہے۔" انہوں نے

کہا اور ہاتھ پر رومال باندھنے لگے۔

اسی وقت ایک کانسٹیبل کی آواز آئی:

"خبردار۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہوٹل کا دروازہ بند کرو۔ انہوں نے دیکھا

کہ پانچ کانسٹیبل ہوٹل کے ہال میں داخل ہو رہے تھے، ان میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔

"بہت خوب! انسپکٹر صاحب کا کلمہ خاصا تیز ہے۔" انسپکٹر جمشید نے تعریف کی۔
 "کیا ان کے خیال میں جیب کترے ہال ہی میں بیٹھے ہوئے ہونگے۔"
 فرزانہ نے کہا۔

"ان کا خیال تو یہی ہوگا۔ اسی لیے ہوٹل کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ ویسے جیب کترے تو کہیں کے کہیں بچھ چکے ہیں۔"

انہوں نے دیکھا کہ سب انسپکٹر کا دستہ کے پاس بیٹھے ہوئے اسٹول پر چڑھ رہے تھے۔
 "کیا اس کا ارادہ تقرر کرنے کا ہے۔" محمود ہنسا۔

"نہیں۔ وہ ہوٹل میں موجود تمام لوگوں کی تلاشی لینے کا ارادہ کر رہا ہے۔"
 "اوہ! تو کیا ہماری بھی تلاشی لی جائے گی۔" فاروق بولا۔

"ہاں! سب کی۔" انسپکٹر جمشید بولے، "ای وقت سب انسپکٹر کی آواز ہال میں گونجی۔"
 "حاضرین! میں معافی چاہتا ہوں کہ ہوٹل کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور
 تھوڑی دیر کے لیے آپ لوگ یہاں سے جائیں سنبھلے۔ دراصل ہم سب کی تلاشی
 لینا چاہتے ہیں۔"

"کیا! بے شمار لوگ چلا اٹھے۔"

"جی ہاں۔ آپ میں سے کوئی اپنا میز سے نہ اٹھے۔"

"لیکن ہم تلاشی کیوں کریں۔ کیا ہم جیب کترے ہیں۔" کوئی صاحب چلائے۔

"آپ جیب کترے نہیں ہیں۔ لیکن کیا آپ نہیں چاہتے کہ جیب کترے
 کڑے جائیں۔"

"چاہتے ہیں۔ چاہتے کیوں نہیں۔" وہ لوگ چلا اٹھے جن کی ابھی ابھی
 جیبیں کی گئیں۔

"تب پھر آپ سب کو تلاشی دینی ہوگی۔" انسپکٹر نے با آواز بلند کہا۔

اس مرحلہ کوئی کچھ نہ بولا۔ اور کاٹھنیل تلاشی لینے لگے۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" سب انسپکٹر نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ وہ ٹھہر گئے۔

"جن لوگوں کی جیبیں کٹیں ہیں، دو کاؤنٹر پر آ جائیں۔"

"ابا جان۔ کیا ہم تینوں بھی جائیں۔" محمود نے پوچھا۔

"نہیں۔ تمہارے بیٹوں میں تھا ہی کیا۔ تم بیٹھے رہو۔"

"جی اچھا۔"

چھ سات آدمی اٹھے اور کاؤنٹر پر چلے گئے۔

"اب تم تلاشی لو۔ اور ہر نوٹ وہاں کو دکھاتے رہو۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"آدمی زمین ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سب انسپکٹر کی تعریف کی۔

"کیا آپ بھی تلاشی دیں گے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔" وہ بولے۔

ہال کے تمام آدمیوں کی تلاشی لینے میں آدھ گھنٹا صرف ہوا۔ لیکن ان ٹلنے
 والوں میں سے کسی نے بھی کسی کے بیٹے کو اپنا بیٹہ نہیں بتایا انسپکٹر جمشید اور ان کے
 بچوں کی بھی باری آئی۔

کاٹھنیل نے چونک کر انسپکٹر جمشید کا بیٹہ دیکھا اور سب انسپکٹر کو کوئی اشارہ
 کیا۔ وہ سیدھا اس کی طرف آیا۔

"ہاں! کیا بات ہے۔" اس نے سرگوشی میں پوچھا لیکن آواز ان تک پہنچ گئی
 کیونکہ ہال میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

"ابنا صاحب کا بیٹہ بہت پھولا ہوا ہے۔ کہیں انہوں نے لوگوں کے بیٹے

خانی کر کے ادھر ادھر نہ پھینک دیے ہوں اور نوٹ اپنے بیٹے میں بھر لیے ہوں۔"

"گڈ! تم نے اچھا خیال ظاہر کیا۔ اچھا میں دیکھ لیتا ہوں۔" سب انسپکٹر نے

کہا اور اسے پکڑ جمشید کی طرف بڑھا:

”ذرا اپنا ڈوہ دکھائیے۔“ اس نے شریقاتہ لہجے میں کہا۔

”کیوں۔ آپ کا آدمی دیکھ تو چکا ہے۔“ انسپٹر جمشید نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"ذرا مٹی بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن۔ آپ نے اور تو کسی کا بیٹہ نہیں دیکھا۔"

"دیکھیے۔ مجھ سے بحث نہ کریں۔ بنوہ مجھے دکھا دیں۔" سب انہماک کے لیے
 میں سختی آگئی۔

"اچھا جناب..... لیجئے۔" آخر انسپکٹر جمشید نے معاملے کو رفع و نفع کی غرض سے کہا اور بیٹھ اُسے دے دیا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا:

"اچھے نوٹ۔ اس شہر میں تو کوئی بڑے میں سوروپے بھی لے کر نہیں آتا۔"
اس نے چیخے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا یہ جرم ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بھی تیز لہجے میں کہا۔ ان کی آواز پر کئی آس پاس کے لوگ ادھر متوجہ ہو گئے اور ان کی آپس کی گفتگو سننے لگے۔

"یہ جرم تو نہیں ہے۔ لیکن شک کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کے بنوے آپ نے اڑائے اور نوٹ ان میں سے نکال کر اس میں بھر لیے۔ تاکہ پکڑے نہ جاسکیں۔"

"خیال تو اچھا ہے۔ مگر۔ خالی بٹے کہاں گئے۔" "نیکلز جیشید نے مسکرا کر بوجھا۔"

”دوا دھرا دھرا بھینک دیئے ہوں گے..... سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

”بہت خوب! تو پہلے خالی بیٹے پر آم کر لو۔“

"ہوسکتا ہے۔ خالی ہٹے تہہ ہارا کوئی آدمی لے کر باہر گیا ہو۔"

"میں کیوں باہر نہیں نکل گیا۔" انسپکٹر جمشید نے جواب میں کہا۔

"بہر حال..... میں آپ کو شک کی بنا پر گرفتار کر رہا ہوں۔" سب انہیں کہنے لگا۔ اور وہ اس کی بات سن کر چونک اٹھے۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی۔ وہ اس شہر کے جیب کتروں کو گرفتار کرنے کی مہم پر آئے تھے اور یہاں الٹا انہیں ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" وہ پرسکون آواز میں بولے۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" وہ پرسکون آواز میں بولے۔

"کیوں؟" سب انیسٹر نے حیران ہو کر کہا۔

”اسی لیے کہ اس واقعے کو ابھی ایک منٹ بھی نہیں ہوا۔“

”لو اس سے کیا ہوتا ہے۔“

$$^{\text{II}} \quad \frac{1}{2} \log \frac{1}{2} = \frac{1}{2} \log \frac{1}{2}$$

"آخر تم کو بتا دیا ہے۔" سب انسپکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔

"میرے بڑے میں اس وقت جتنے نوٹ ہیں۔ تم انہیں ایک منٹ میں گن سکتے ہو۔" وہ مسکرائے۔

”کیا مطلب ہے؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”جب کہ میں بتا سکتا ہوں۔ میری جیب میں کتنے کتنے نوٹ ہیں۔“

سب انکسز یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا۔ سامنے بیٹھا نوا شخص کوئی
 نے وقف نہیں ہے۔ یہ ٹھک کہہ رہا ہے۔ آخر وہ سوچ کر بولا:

"اچھا جاؤ۔ تمہارے برس میں ملے لگتے ہو لے ہیں۔"

انہیں ہزاروں سوچیدہ روئے۔ انہیں کٹر ہنسکرائے۔

اردو رقم ایک منٹ میں معنی جانتی ہے۔ "سب انسپکٹر خواجہ۔"

شاید تم ایک منٹ میں گن لو۔ لیکن گننے کے بعد فوراً ہی نہیں بتا سکتے کہ کونسا کونسا سے نوٹ کتنے کتنے چرہ۔ جس کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

$\frac{1}{\sqrt{\pi}} \int_{-\infty}^{\infty} f(x) e^{-x^2} dx = \frac{1}{\sqrt{\pi}}$

"اچھا بتائیے۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

انسپکٹر جمشید بتانے لگے۔ وہ نوٹ گن گن کر تعقد ہی کرتا رہا۔

آخر میں اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انسپکٹر جمشید نے ایک ایک بات صحیح بتائی تھی۔

"کیا آپ اسی شہر میں رہتے ہیں۔"

"نہیں۔"

"کہاں سے آئے ہیں۔"

"اوپر سے۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

"کیا مطلب۔ کیا آسمان سے آئے ہیں؟" سب انسپکٹر نے خطرے لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں اس ہوٹل کی دوسری منزل پر ٹھہرا ہوا ہوں اس لیے کہا ہے کہ

اوپر سے آیا ہوں۔" وہ مسکرائے۔ کئی لوگ ان کی بات پر ہنس پڑے۔

"آپ کے کمرے کا نمبر کیا ہے۔"

"ایک سو گیارہ۔"

"بہت اچھا۔ آپ ہوٹل چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ جب تک کہ آپ کو ہماری

طرف سے اجازت نہ ملے۔"

"وہ کیوں۔"

"اس لیے کہ آپ اب بھی شک کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ ہمارے انسپکٹر

صاحب آپ سے کچھ پوچھ گچھ کرنا پسند کریں گے۔"

انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔ اس کے بعد کاشیوں نے پورے ہوٹل کی خلاشی

بھی لی مگر انہیں کہیں سے کوئی خالی ہونہ نہیں ملا۔

☆☆☆

حیرت ہے

انسپکٹر ساجد سخت پریشان تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے دفتر میں دونوں ہاتھوں سے سر تھا سے بیٹھا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اب تک انسپکٹر جمشید کیوں نہیں آئے۔ شہر کی حالت وہی تھی۔ لوگوں کی جیبوں پر جیسیں کٹ رہی تھیں اور اس کا ناک میں دم آیا ہوا تھا۔

اچھی اچھی اسے ایک اور حیرت انگیز اطلاع ملی تھی۔ ایک کانشیل نے بتایا تھا کہ مون لائٹ ہوٹل میں پہلے ایک ٹی ٹی ٹی اور اس کے پیچھے ایک کتا۔ پھر ہوٹل میں ہڑ بونگ بونگ مچی اور اس ہڑ بونگ میں چھ سات لوگوں کی جیب کٹ گئیں۔ وہ جیب کٹروں کی دیدہ دلیری پر حیرت زدہ رہ گیا اور مون لائٹ ہوٹل جانے کے لیے اٹھا ہی تھا اس کا ماتحت سب انسپکٹر اندر داخل ہوا۔

"کہاں چلے سرا!"

"مون لائٹ ہوٹل۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہاں بھرے پڑے بال میں چھ سات آدمیوں کی جیسیں کاٹ لی گئی ہیں۔" انسپکٹر ساجد نے بے اسامہ بنا کر کہا۔

"جان ہوں سرا!"

"تو پھر تم سیدھے وہاں کیوں نہیں پہنچے۔ یہاں کیا فیض آئے ہو۔"

"سرا! میں اس وقت ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا جب یہ واقعہ پیش

آیا۔"

"اوہ پھر؟"

"پھر یہ کہ پانچ کانشیولوں کو لے کر ہوٹل میں ٹکس گیا۔ اس کا بیرونی دروازہ بند کر دیا اور ہال میں موجود تمام لوگوں کی تلاش لی۔"

"تو کیا کوئی جیب کترا پکڑا گیا۔" انسپکٹر ساجد خوش ہو کر بولا۔

"جی تو انسوس ہے کہ نہیں پکڑا جاسکا البتہ..... ہال میں ایک شخص کی جیب سے بہت پھولا ہوا نوٹہ نکلا تھا۔ اس کے نوٹے میں ساڑھے تیس ہزار روپے کی رقم تھی۔ مجھے اس پر شک ہے۔"

"تو تم اسے پکڑ کر کیوں نہیں لائے۔"

"میں چاہتا تو یہی تھا۔ مگر وہ شخص بہت چالاک ثابت ہوا۔"

"تو کیا وہ فرار ہو گیا۔"

"جی نہیں۔ بلکہ وہ تو اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے، میں اسے پابند کر آیا ہوں اور ہوٹل کے منیجر سے بھی کہہ آیا ہوں کہ اگر وہ ہوٹل چھوڑ کر جانے لگے تو فوراً ہمیں اطلاع دے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چل کر اسے دیکھتا ہوں، وہ کتنا چالاک ہے۔"

"چلیے۔"

دونوں اٹھ کر باہر آئے اور جیب میں بیٹھ گئے۔ اچانک سب انسپکٹر کارنگ اڑ

گیا۔

"ایک منٹ ٹھہرے سر!" وہ جیب سے اترتا ہوا بولا۔

"کیا بات ہے۔" انسپکٹر ساجد نے اسے بری طرح گھورا۔

لیکن وہ تو یہ کہتا ہوا دوبارہ کمرے میں ٹکس گیا تھا:

"ابھی آیا سر!"

پھر وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر ہائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔ اتنے گھبرا کیوں گئے ایک دم۔" انسپکٹر بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اب یہ ثابت ہو جاتی ہے۔" سب انسپکٹر بڑبڑایا۔ جیب میں بیٹھ کر اسٹیرنگ سنبھال چکا تھا۔

"کون سی بات ثابت ہو جاتی ہے۔" انسپکٹر ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ضرور جیب کتروں کا سردار ہے۔"

"کون۔ دور۔"

"وسی۔ جس سے آپ بٹے جا رہے ہیں۔"

"یہ کیا یک۔ تم اس نتیجے پر کیسے پہنچ گئے۔ ابھی ابھی تو تمہیں اس پر صرف شک تھا۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سر۔۔۔۔۔ میرا۔۔۔۔۔"

"کیا بات ہے بھئی۔" انسپکٹر ساجد حیران تھا۔

"دو۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میرا نوٹہ۔" سب انسپکٹر نے اپنی جیب الٹ کر

دکھا دی جو خالی تھی۔

"کیا!" انسپکٹر ساجد چلا یا۔

☆

انسپکٹر جمشید اپنے کمرے میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے آج کی حیرت انگیز واردات کے متعلق باتیں کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے۔

"جیب کترے واقعی بہت دیدہ دلیر ہیں۔"

"کیا آپ بھی نہیں دیکھ سکے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"کیا نہیں دیکھ سکا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"جب لوگوں کی جیبیں کافی گئیں، اس وقت آپ نے کسی کو کاٹتے ہوئے نہیں

دیکھا۔"

"نہیں۔ میرے لیے بھی یہ اتنا ہی اچانک خوش آیا جتنا دوسروں کے لیے۔

دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھرے پرے ہال میں اس دیدہ دلیری سے

واردات کر جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"اور اب سب انسپکٹر صاحب اپنے انسپکٹر کو لے کر یہاں آئیں گے۔"

فاروق نے لطف لے کر کہا۔

"ہاں! سب انسپکٹر کو تو ویسے بھی آچر ہے گا۔" انسپکٹر ہشید مسکرائے۔

"کیوں۔ یہ کس لیے کہہ رہے ہیں آپ۔" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اسے ابا جان پر شک ہو گیا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"میں اتنا تو سمجھتا ہوں۔ لیکن ابا جان کے لہجے میں کوئی اور جھلک بھی

تھی۔" محمود بولا۔

"اب تمہیں لہجوں میں بھی جھلک نظر آنے لگی۔" فاروق نے اس کا مذاق

اڑایا۔

"تو تمہیں کس چیز میں جھلک نظر آتی ہے۔" محمود نے جمل کر کہا۔

"تم میں جھلک نظر آتی ہے۔ تاکہ کس قسم کی۔" فاروق مسکرایا۔

"جی فرمائیے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔" محمود نے جملہ کہنے لہجے میں کہا۔

"نہیں کی۔۔۔" فاروق بولا اور فرزانہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"کھی کھی کرتی ہوئی تم بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" محمود اس کی طرف جھٹاکر

مڑا۔

"تو کیا ریں ریں کرتی ہوئی اچھی لگتی ہوں۔" فرزانہ نے بھی ترکی بہ ترکی

جواب دیا۔

"تم تو لڑنے لگے۔ بات ہو رہی تھی سب انسپکٹر کی۔" آخر انسپکٹر جشید نے

داخل دیا۔

"جی ہاں۔ یہ دونوں تو یونہی بات کو کہیں سے کہیں گھسیٹ کر لے جاتے

ہیں۔" محمود بول اٹھا۔

"لو۔ اب باتیں بھی سمجھنی جانے لگیں۔" فرزانہ نے کھی کھی پھر شروع

ہو گئی۔

"فرزانہ۔ رُئی بات ہے۔ محمود تمہارا بڑا بھائی ہے۔" انسپکٹر جشید نے

مسکراتے ہوئے ڈانٹا۔

"اوہ۔ ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

"چلو شکر ہے۔ تمہیں یاد تو آیا۔" محمود ابھی تک غصے میں تھا۔

"اور فرزانہ۔ کہیں تم یہ بھی تو نہیں بھول گئیں کہ میں بھی تمہارا بڑا بھائی

ہوں۔" فاروق ہنسا۔

"جی بھائی جان۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔"

"تو بہ! ان تینوں کی زبانیں تو پہلے گھڑنے کی مشینیں ہیں۔" عظیم جشید

بولیں۔

"شکر بھائی جان۔" تینوں ایک ساتھ بولے۔ انسپکٹر جشید اور عظیم جشید اپنی

جلی کسی طرح شدوک سکے۔

"اب اچان۔ آپ کہہ رہے تھے کہ سب انسپکٹر تو ویسے بھی آئے گا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اپنی جیب کٹ گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"تین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔"

"محمود دیکھو کون ہے۔"

"جی۔ اچھا۔" محمود نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو حیرانظر آیا۔

"کیا بات ہے۔" محمود نے چونک کر پوچھا کیونکہ میرے تو صرف ہاتھ پر

ہی آتے ہیں۔

"رو پولیس آفیسر آپ کے والد کو نیچے بار ہے ہیں۔" میرے نے کہا۔

"انسپکٹر جمشید نے اس کے الفاظ سن لیے تھے لہذا وہ خود ہی بولے۔

"تم انہیں اوپر ہی لے آؤ۔"

"جی؟" میرا حیران رہ گیا۔

"ہاں بھئی۔ کہہ دو۔ اوپر ہی مشرف لے آئیں۔"

"جی اچھا۔"

میرے نے کہا اور میری حیاں اُترتا چلا گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا۔ اب سب انسپکٹر کا پارہ اور چڑھ جائے گا۔"

"بھئی تو میں چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"یہ دیکھو۔ یہ کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بیب سے کوئی چیز نکالتے ہوئے

کہا۔

"ارے۔ یہ بڑا آپ کا تو نہیں۔" محمود نے ان کے ہاتھ میں بندھ دیکھ کر

کہا۔

"ہاں! یہ اس سب انسپکٹر کا ہے۔"

"کیا! وہ حیران رہ گئے۔"

"یہ آپ کے پاس کیسے آ گیا۔"

"بھئی وہ بھی کہ میں نے کہا تھا سب انسپکٹر کو تو ویسے بھی آنا پڑے گا۔"

"آخر یہ آپ کو کیسے مل گیا۔"

"میں نے اس کی جیب سے نکالا ہے۔"

"جی!"

"ان کی" جی" لمبی ہوتی چلی ہوئی۔ اس وقت دروازے پر ایک بار پھر دستک

ہوئی۔

☆☆☆

تین پُرزے

"ابا جان! وہ آگے۔ آپ پرس کو چھپالیں۔" محمود جلدی سے بولا۔
 "کیوں۔ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ جا کر دروازہ کھول دو۔" انسپکٹر جمشید نے پرس کو میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں دیکھتے جاؤ۔" وہ مسکرائے۔ محمود نے دروازے کے پاس جا کر چٹی گرا دی۔ جو ٹہنی وہ دروازہ کھول کر مڑا انسپکٹر جمشید غائب تھے۔

"ارے!" اس کے منہ سے نکلا۔ اسی وقت دونوں آفیسر اندر داخل ہوئے۔
 "سرفورہ ہا میرا نوہ دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا لیجیے یہ کڑا گیا۔" سب انسپکٹر چلا گیا۔
 "یہ تمہارا پرس ہے۔" ساجد نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"ٹھیک ہے۔ بچہ تمہارے والد کہاں ہیں۔"
 "ہم انہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" ساجد نے کہا۔
 "وہ غسل خانے میں ہیں۔"

"اوو! اچھا۔" دونوں بیٹھ گئے۔

انسپکٹر ساجد کبھی ان سے نہیں ملتا تھا اس لیے جان نہ سکا۔ اسی وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا اور انسپکٹر جمشید ہاتھ میں تولیہ لیے باہر نکلے:

"کیا آپ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔
 دونوں چونک کر مڑے۔

"جی ہاں۔ ثبوت یہ موجود ہے۔ میرا پرس جو تم نے میری جیب سے نکالا ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا اور پھر اپنے اسکر کی طرف دیکھا مگر وہ تو حیرت کی وجہ سے ریت بنا کھڑا تھا۔

"تو میں کب کہتا ہوں کہ میں نے پرس نہیں نکالا۔"
 "مجرم اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہے سراسر!" سب انسپکٹر نے کہا۔
 "ہوں۔ تم کب آئے اور یہ آنے کا کون سا طریقہ ہے۔" ساجد نے انہیں گھور کر کہا۔

"کل کا آیا ہوا ہوں۔ نہ صرف میں۔ بلکہ یہ لوگ بھی۔" انسپکٹر جمشید نے بیوی بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو یہ بھابھی ہیں۔ اور یہ محمود، فاروق اور فرزان۔"

"ہاں!"

"کمال ہے۔ تمہیں یہاں آ کر ظہیر نے کیا ضرورت تھی۔"
 "سیدھا تمہارے پاس جانا تو جیب کتروں کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ بچہ تم نے اپنے انگل کو سلام نہیں کیا۔" وہ ساجد سے کہتے کہتے ان تینوں کی طرف مڑے۔
 "انگل السلام وغیرہ۔" تینوں ایک ساتھ بولے۔

ساجد نے مسکرا کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ انہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ سب کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

"بیٹھو! ہر۔ ان سے ملو۔ یہ ہیں انسپکٹر جمشید۔ میرے دیرینہ دوست۔"

"جی! طاہر حیران رہ گیا۔"

"ہاں۔ یہ ہماری مدد کرنے آئے ہیں۔ جیب کتروں کو پکڑنے کے سلسلے میں۔"

"اور آپ اٹا جھکے ہی گرفتار کر رہے ہیں۔" اسپیکر جشیہ مسکرائے۔

"لیکن آپ نے میرا بیٹو کیوں نکالا۔" طاہر نے پوچھا۔

"تاکہ تم ساجد کو یہاں لے آؤ۔"

"حیرت ہے۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب آپ نے بیٹو نکال لیا۔"

"تو ہمارے شہر آتے ہی تمہارے سامنے ایک واردات بھی ہوگئی۔" ساجد

بولے۔

"ایک نہیں۔ تین۔" اسپیکر جشیہ مسکرائے۔

"تین۔ کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا۔"

"پہلی واردات میرے ساتھ ٹرین میں ہوئی۔ آپ کے شہر کے ایک مہربان

نے میرا بیٹو اڑا لیا۔"

"ارے! ساجد اور طاہر ایک ساتھ بولے۔

"پھر چیکسی ڈرائیور نے بھی یہی کیا۔"

"اوو!"

"ان دونوں سے تو میں نے بیٹوے حاصل کر لیے۔ تیسری مرتبہ اس نے اپنا

بیٹو چوری ہی نہیں ہونے دیا۔ البتہ محمود، قادیق اور فرزانہ کے بیٹوے جیب کتروے

لے گئے۔ اور ہاں۔ تمہاری بھابھی کے پرس میں سے ایک نعلی زبرد بھی۔"

"کیا۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔"

"اب یہ تینوں تمہیں بتائیں گے کہ ان کے بیٹوں میں کیا کیا تھا۔ چاہو تو

باقاعدہ رپورٹ بھی لکھ سکتے ہو۔"

"لیکن۔ تم نے ان دونوں کا کیا کیا۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کرنا کیا۔ ان کو جانے دیا۔"

"وہ کس خوشی میں۔"

"دوبارہ پکڑنے کی خوشی میں۔ میں ان کو اکٹھے ہی پکڑوں گا۔"

"اکٹھے۔ کیا مطلب؟"

"یہاں کوئی باقاعدہ گروہ یہ حرکتیں کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رات کو کہیں

اکٹھے ضرور ہوتے ہیں۔ گروہ کے سرور کو اپنی اپنی دن بھر کی کمائی دینے کے لیے۔"

"کمال ہے۔ تم آتے ہی اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے۔"

"تم نے ان تینوں سے تو پوچھا ہی نہیں کہ ان کے بیٹوں میں کیا کیا تھا۔"

"اوو۔ ہاں۔ یہ تو میں بھول گیا۔ طاہر میاں تم جاسکتے ہو۔ آنکھیں کھلی رکھو۔"

"اچھا۔" طاہر کمرے سے نکل گیا۔

"ہاں! اب بتاؤ۔ تمہارے بیٹوں میں کیا تھا؟"

☆☆

رات کے توج رہی تھی۔

دولت پور کی ایک عمارت کے بڑے سے کمرے میں اس وقت کوئی دس کے

قریب اچکے جمع تھے۔ ان سب کے چہرے غیر متضام تھے۔ کمرے میں ان کے

ہاتھ کرنے سے ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے کھیاں۔ جھنڈا رہی ہوں۔ اچانک ہاں

میں خاموشی چھا گئی۔ ایک دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے ایک لمبا ترنٹا شخص اندر داخل

ہوا۔ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ وہ سب اٹھ گئے۔ کئی ایک کے منہ

سے نکلا۔ "استاؤ!"

وہ کمرے کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک اونچی جگہ پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم سب نے اپنے اپنے بیٹوں کو کھول کر نہیں دیکھا ہو گا۔ کیونکہ ہمارا اصول ہے۔ جو مال جس حالت میں ملے، اسے اسی صورت میں یہاں لے آؤ۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی بیٹہ کھول کی دیکھنے کی جرأت کی ہے تو وہ کھڑا ہو کر خود ہی بتا دے۔ اس وقت میں اسے کچھ نہیں کہوں گا..... لیکن اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ کسی نے ایسی حرکت کی تھی تو پھر اس کی خیر نہیں"

سب نے خاموشی سے اس کی بات کو سنا..... لیکن کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا.....
 "ٹھیک ہے، اب باری باری اپنے بیٹے کو کھول کر اس کا اعلان کرو۔"
 استاد نے اطمینان سے کہا۔

ان میں سے ایک اٹھا۔ اور کہنے لگا:

"استاد! آج میں نے تین آدمیوں کے بیٹے لڑائے ہیں۔"

اس نے بیٹے دکھاتے ہوئے کہا پھر وہ ایک بیٹہ کھول کر دیکھنے لگا۔

"ان میں سے ایک میں ایک ہزار روپے، دوسرے میں پانچ سو تیس روپے، تیسرے میں صرف انیس روپے ہیں۔"

"ایک ہزار روپے والا ہماری طرف اچھا دو۔ باقی دو تمہارے؟" استاد نے حکم دیا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور پس استاد کی طرف اچھا دیا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کے بعد دوسرا آدمی کھڑا ہوا۔

"میرے ہاتھ صرف ایک بیٹہ لگا، اس میں ڈیڑھ ہزار روپے ہیں....." اس نے بتایا۔

"پچاس سو روپے دکھ کر بیٹہ میری طرف اچھا دو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی پھر تیسرا شخص کھڑا ہوا:

"میرے ہاتھ صرف ایک بیٹہ لگا۔ اسے اب تو خالی ہے۔" سب ہنسنے لگے:

"ختم خالی نہیں ہے۔ اس میں تو ایک سفید کاغذ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بیٹے میں سے کاغذ نکالا اور اسے بلند آواز میں پڑھا:

"بیٹے آئے اچھے کثیر۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" استاد فرمایا۔

"خدا جانے استاد۔"

"کاغذ مجھے دکھاؤ۔" استاد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

اچکا استاد کے پاس گیا اور کاغذ اس کو دے دیا۔ اس نے کاغذ پر لکھا جملہ پڑھا اور خیران ہو کر پوچھا:

"یہ بیٹہ تم نے کہاں سے لڑایا تھا۔"

"سون لائٹ ہوٹل کی میز پر ایک نو عمر لڑکے کی جیب سے۔"

"ہوں۔" دوسوچ میں ڈوب گیا۔

"استاد۔ میں نے اسی میز کے دوسرے لڑکے کی جیب سے پرس لڑایا تھا۔"

"تو نکالو تم بھی۔ اور دیکھو اس میں کیا ہے۔"

اس نے جیب سے بیٹہ نکالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ وہ بیٹے میں سے ایک کاغذ نکال رہا تھا پھر اس نے کاغذ پر لکھا ہوا جملہ پڑھا۔

"اچکوں کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔"

"یہ سب کیا ہے۔"

"اور استاد۔ میں نے بھی اسی میز پر بیٹی ایک لڑکی کا پرس لڑایا تھا۔"

"کیا؟" استاد تقریباً چلا یا۔ "نکالو تم بھی۔ اور پڑھو اس میں کیا لکھا ہے۔"

تیسرا اچکا پرس میں کاغذ نکالنے لگا۔

کی نگرانی کراؤ۔"

"یہاں جتنی بھی ٹیکسیاں چلتی ہیں، وہ ایک ہی آدمی کی ملکیت ہیں۔ وہی مالک ہے۔ اس سے اس ڈرائیور کے گھر کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔" ساجد نے بتایا۔
"ابھی شام کے پانچ بجے ہیں، وہ اڈے میں موجود ہوگا۔"

"بس تو پھر پہلے یہی بات معلوم کرنی چاہئے۔"

"ابا جان۔ کیوں نہ ہم بھی چلیں۔ شہر کی تھوڑی سی سیر ہی ہو جائے گی۔"

"چلو یونی سہی۔ بیگم تمہارا کیا خیال ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر پوچھا۔

"میں تو بہت تنگن محسوس کر رہی ہوں۔ آرام کروں گی۔ آپ لوگ چائیں۔"

وہ ہوٹل سے باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے اور ٹیکسیوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ چند منٹ بعد وہ وہاں پہنچ گئے۔

"کیا خیال ہے۔ مالک کو کونسیں بلا لیا جائے۔" ساجد نے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"اچھا! میں لاتا ہوں۔" ساجد نیچے اتر ا اور اڈے کے اندر بنے ایک کمرے

کی طرف چلا گیا۔ جلد ہی ایک لمبے چوڑے آدمی کے ساتھ واپس آ گیا۔

"فیروز تمہاری ٹیکسی نمبر ۳۹۴۳ آج کل کون چلا رہا ہے۔" ساجد نے پوچھا۔

"کیوں۔" انسپکٹر صاحب کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔"

"اس سے کچھ کام ہے ہمیں۔"

"اس کا نام باہر ہے۔"

"کہاں رہتا ہے۔"

"احسان روڈ پر مکان نمبر ۱۱۹۔"

"بہت بہت شکریہ۔" ساجد نے کہا۔

گاڑی والا

"اور اب بیٹی! تم بتاؤ۔ تم نے اپنے پرزے پراچکوں کو کیا پیغام دیا ہے۔"

محمود اور فاروق اپنے اپنے جملے بتا چکے تو ساجد نے جس کرفرزانہ سے پوچھا۔

"انگل میں نے اپنے پرزے پر لکھا تھا۔۔۔ دولت پور کے تمام اچکوں کو چاہیے کہ وہ دولت پور کی تمام دولت سمیٹنے کا خیال دل سے نکال دیں۔"

"بہت خوب۔ اچکے بھی خوب چکرا رہے ہوں گے یہ پرزے پڑھ کر۔"

ساجد ہنسا۔

"مگر حیرت ہے۔ انہوں نے بچوں کے ہونے بھی نہ چھوڑے۔"

انسپکٹر ساجد بولا۔

"معلوم ہوتا ہے ان کی تعداد کچھ زیادہ رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھا۔ اب تمہارا پروگرام کیا ہے؟" ساجد نے پوچھا۔

"محمود۔ تم نے ٹیکسی کے نمبر نوٹ کیے تھے۔"

"جی ہاں۔ یہ ہے۔" محمد نے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

"یہاں ٹیکسیوں کے کتنے اڈے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"صرف ایک۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تم اس ٹیکسی ڈرائیور کے گھر کا پتا وہاں سے معلوم کر کے اس

"آپ نے بتایا نہیں اس سے کیا کام آچکا ہے۔"

"کوئی خاص کام نہیں ہے۔" ساجد نے کہا اور جیب اشارت کر دی۔

"اب کیا کیا جائے۔" ساجد نے کچھ دور آ کر پوچھا۔

"اس کے مکان کی نگرانی کراؤ۔ صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ رات کے وقت

وہ اپنے گھر سے کہیں جاتا تو نہیں۔ اور جاتا ہے تو کہاں۔"

"بہت اچھا۔ میں طاہر کی ذیولہ وہاں لگا دیتا ہوں۔"

"اب کہاں چلیں۔"

"ہمیں ہوٹل میں چھوڑ کر تم کہیں بھی جاسکتے ہو۔"

"تو تم لوگ میرے ہاں نہیں چلو گے۔"

"نہیں۔"

"آخر اس ہوٹل میں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"وہ کچھ ساجد۔ تم جیب کمرہ کو کچڑنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

"بالکل چاہتا ہوں۔ آج کل تو اس سے بڑی کوئی خواہش ہی نہیں ہے۔"

"تو بس پھر..... ہمیں یہاں رہنے دو۔ اچکیوں کی گرفتاری کے بعد البتہ

تمہارے ہاں دو چار دن ضرور گزاریں گے۔"

جو جی جیب مولن لائٹ ہوٹل کے سامنے رکی۔ انپکنر جیسے پوک اٹھے:

"محمود..... فاروق..... اس شخص کو دیکھ رہے ہو۔" انہوں نے ایک آدمی کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ہوٹل سے باہر نکل رہا تھا۔

"اوہ۔" وہ تینوں اسے دیکھ کر چلے گئے۔

"یہ تو وہی ہے جس نے ٹرین میں آپ کی جیب کاٹی تھی۔"

"نیکل نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ آج کس قسم کے ہونے چوری کر کے لوٹے ہو۔" استاد نے قہر پر زور بھینکتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

"ہم خود حیران ہیں استاد۔"

"کیا اس میز پر تین بچے ہی بیٹھے تھے۔"

"جی نہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت بھی تھی۔"

"تب پھر تم نے ان دونوں کے پرس کیوں نہیں نکالے بچوں کے ہنڈوں میں

کیا خاص بات تھی۔" استاد نے طنز پر لہجہ میں کہا۔

"میں نے مرد کی جیب پر تین مرتبہ ہاتھ ڈالا۔ مگر وہ پہلے ہی ہنڈے کو تھامے

ہوئے تھا۔" ایک اچکا بولا۔

"اور میں نے عورت کے پرس کو کھولی کر دیکھا تو وہ خالی تھا۔"

"حیرت ہے۔ آخر یہ لوگ کون ہیں۔ جو ہمیں لٹا رہے ہیں۔"

"اس شہر کے تو معلوم نہیں پڑتے تھے۔"

"ہوں..... کل مولن لائٹ ہوٹل میں جا کر معلوم کرو۔ وہ اسی ہوٹل میں

ظہرے ہوئے ہیں یا کہیں اور۔ مجھے یہ خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔"

"استاد۔ مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔" ایک اچکا بولا۔

"کیا بات یاد آ رہی ہے تمہیں۔"

"کل میں گاڑی میں بیٹھا روٹ پورا رہا تھا تو ایک آدمی کے ساتھ بیٹھا

تھا۔"

"ظاہر ہے کہ تم کسی حیوان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔" استاد نے کہا جس

پر سب ہنسنے لگے۔

"تم سنو تو سہی۔ اس مرد کے ساتھ ایک عورت اور تین بچے تھے۔"

"کیا مطلب۔" وہ چونکے۔

"اور میں نے مردکی جیب میں سے ہنڈ نکال لیا تھا۔"

"بہت خوب۔" استاد نے خوش ہو کر کہا۔

"پھر میں گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی گاڑی سے اتر گیا تھا۔"

"واہ۔ مجھے تم پر فخر ہے۔"

"مجھ پر فخر نہ کرو استاد۔ جب میں نے پیچھے اتر کر اس کا ہنڈ جیب سے نکالنا چاہا تو ہنڈ میری جیب میں نہیں تھا۔"

"کیا! "سب حیرت سے چلائے۔"

"وہ کوئی معمولی آدمی مظلوم نہیں ہوتے۔ یہ ضرور وہی ہیں جو تمہیں گاڑی میں ملے تھے۔ جب تو ٹھیک رہے گا کہ کل تم ہی مون لائٹ ہوٹل چا کر پتا کرو۔"

"جی بہتر۔"

"ان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہو سکے، کرنا۔۔۔۔۔"

اس کے بعد اپنے اپنی اپنی دن بھر کی کارگزاری بیان کرنے لگے۔

☆☆☆

طاہر کا ہنڈ

"کیا اسے پکڑ لیا جائے۔" ساجد نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ پکڑنے سے کام خراب ہو جائے گا۔ یہ ہمیں پہچانتا ہے۔ اس لیے تم اس کا تعاقب کرو گے۔"

"شام کا وقت ہے۔ یہ اس وقت اچکوں کے ٹھکانے پر تو جا نہیں رہا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے، یہ اپنے گھر جائے۔ اس طرح ہمیں دو اچکوں کے گھروں کا پتا معلوم ہو جائے گا۔ پھر ہم ان دونوں کی ایک وقت گھرائی کرانیں گے اور اس طرح یہ ہمیں خود اپنے ٹھکانے پر لے جائیں گے۔ کیوں کہی رہے گی۔"

"بہت خوب۔ تو میں اس کے پیچھے جاؤں۔"

"ہاں۔ لیکن وہ پیدل چل رہا ہے۔ تمہیں جیب کو ہمیں چھوڑنا پڑے گا۔ ویسے

بھی جیب کو دیکھ کر ہوشیار ہو سکتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں پیدل ہی جا رہا ہوں۔" ساجد نے کہا اور جیب سے اتر

کر اس طرف روانہ ہو گیا جہاں سے وہ گیا تھا۔

"آؤ۔ ہم اپنے کمرے میں چلیں۔ آج کا کام ختم۔"

وہ ہوٹل کے اندر داخل ہوئے اور میز چیاں چڑھنے کے بعد اپنے کمرے کے

دروازے پر پہنچے۔ ان کے اٹھتے قدم رک گئے اور کمرے میں کسی کے باتیں کرنے کی

آواز آرہی تھی۔ وہ حیران ہوئے بغیر نہ وہ سکے کہ بیگم جمشید کس سے باتیں کر رہی ہیں۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ بیگم جمشید نے دروازہ کھولا۔ تو اندر انہیں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر ہنس پڑے کہ ڈانسسٹر آن تھا اور اس پر کوئی عورت کھانے پکانے کی ترکیبیں بتا رہی تھی۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔" محمود نے کہا۔

"اور ہم حیران ہونے لگے کہ یہاں آپ کی جان پہچان کا کون کون لگا آیا۔"

"آپ کے جاننے کے بعد میں نے یہاں اس گاڑی والے جیب کترے کو دیکھا تھا۔" بیگم جمشید بولیں۔

"ہاں۔ ہم بھی اسے دیکھ چکے ہیں۔"

"تو کیا آپ نے اسے پکڑ لیا۔"

"نہیں۔ ساجد اس کا پیچھا کر رہا ہے۔"

"میں تو کہتی ہوں، انہیں ایک ایک کر کے پکڑتے رہیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

"اس طرح صرف دو چار ہی پکڑے جاسکیں گے، باقی ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"آخر اس شہر میں اتنے جیب کترے کہاں سے آئیں گے۔"

"یہی تو دیکھنا ہے۔ اسی لیے تو میں ابھی ان پر ہاتھ نہیں ڈال رہا ہوں۔"

"تو ہم ساجد کے گھر کیوں نہ چلیں۔"

"کیوں؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے ہوٹل میں انہیں ہی ہوتی ہے۔ ہر وقت غیر مردوں کا آنا سامنا ہوتا

رہتا ہے۔"

"تو تم اپنے کمرے میں رہا کرو۔ کھانا بھی یہیں منگوا لیا کرو۔"

"اور آپ نیچے ہال میں کھائیں گے۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں ایک دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ ایک دو دن کے اندر آپ تمام جیب کترے کو گرفتار کر لیں گے۔"

"خیال تو یہی ہے۔"

"جیب کترے معمولی ذہانت کے نہیں ہیں۔ بہت پھر چلے بھی ہیں۔"

فرزانہ بولی۔

"ہاں! لیکن تم دیکھ چکی ہو کہ ان کی کوشش کو تین مرتبہ کام نہ چکا ہوں۔"

"کیا اس وقت آپ کا پرہیز آپ کی جیب میں ہے۔ محمود نے پوچھا۔"

"ہاں۔ کیوں۔ کیا تمہارا خیال ہے، مجھے ہوگا۔" انسپکٹر جمشید جیب میں ہاتھ

ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بری طرح چوہے گئے:

"ارے ا"

"کیا ہوا۔" چاروں بیک وقت بولے۔ "کیا آپ کا ہنڈو جیب میں نہیں

ہے۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن وہ ظاہر والا ہنڈو کہاں گیا۔"

"وہ۔ وہ تو میز پر تھا۔ ظاہر نے لے لیا ہوگا۔"

"نہیں۔ ظاہر اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے نہیں

دیکھا۔ پھر۔ آخر وہ ہنڈو کہاں چلا گیا۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور "حق میں کھو گئے۔ چاروں انہیں حیران نظر دے

سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

اچکے پھر اسی ہال میں جمع تھے، اور مچی کرسی پر ان کا استاد آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک وہ اچکا اندر داخل ہوا جس نے گاڑی والا واقعہ سنایا تھا:

"تم بہت دیر سے آئے۔"

"میرے پیچھے پولیس کا ایک سپاہی لگا ہوا تھا۔ اسے چمکے دیکر یہاں پہنچا ہوں۔"

"کیا مطلب۔" استاد چونکا۔

"جی ہاں۔ میری گھرانہ نکل سے شروع ہوئی ہے۔"

"اوہ! اچھا۔ ان کے متعلق کیا معلوم ہوا۔"

"کچھ پتا نہیں چلا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں ان کا نام مسٹر ایڈمز اور ڈوردرج ہے۔"

"تم ایک دم آؤ ہو۔" استاد نے غصے میں کہا۔

"جی کیا مطلب۔"

"نمبر نو کھڑا ہو جائے۔"

ایک اچکا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جس نے ٹیکسی میں انسپکٹر جمشید کا بیٹہ اڑایا تھا۔

"تم دونوں نے ہم سب کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔"

"کیا مطلب۔" ٹیکسی ڈرائیور چونک کر بولا۔

"اب تمہارا شہر میں گھومنا اچھا نہیں ہے۔ آج سے تم اسی عمارت میں رہو گے۔ یہاں سے ایک منٹ کے لیے باہر نہیں نکلو گے۔"

"لیکن استاد۔ یہاں تو ہمارا دم گھٹ جائے گا۔"

"اور تمہاری وجہ سے اگر ہم سب پکڑے گئے۔"

"آخر کیسے۔۔۔۔۔"

"پوچھ لو نمبر سات سے۔ جس کی گھرانہ ہو رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے، تمہاری گھرانہ بھی ہو رہی ہوگی۔"

"تو پھر۔۔۔۔۔"

"تم اپنی اس عمارت کے ایک کمرے میں بند رہو گے۔ تمہارا کھانا وہیں پہنچا جایا کرے گا۔"

"استاد۔۔۔۔۔ یہ ظلم ہے۔ ہم دم گھٹ کر مر جائیں گے۔۔۔۔۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔ ہم خطرے سے آزاد ہو جائیں گے۔"

"کم از کم ہمیں اس عمارت میں تو گھومنے پھرنے کی اجازت دو۔"

"تا کہ تم کھڑکی سے جھانکو اور ہم سب پھنس جائیں۔ ٹیکسی یہ نہیں ہو سکتا۔"

"آخر بات کیا ہے استاد۔ پہلے تو آپ بھی پولیس سے اتنا نہیں ڈرے۔"

"تم نہیں جانتے۔ ان دنوں یہاں انسپکٹر جمشید اور اس کے بچے آئے ہوئے ہیں۔"

"کیا! بیسیوں آوازیں ابھریں۔"

"ہاں اور شخص۔ جس کا نام تم دو دو جاسے ہو انسپکٹر جمشید ہے۔"

"اوہ!"

ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

فرزانہ کا خیال

انسپیکٹر ساجد ان کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آپس میں ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ سب انسپکٹر طاہر اندر داخل ہوا۔ دروازے میں داخل ہوتے وقت اسے سر کو کچھ جھکانا پڑا تھا کیونکہ وہ قدم کے معاملے میں بہت خوش نصیب واقع ہوا تھا۔

"کہو انسپیکٹر کیا رپورٹ ہے۔" انسپیکٹر جمشید نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"ٹیکسی ڈرائیور رات سے غائب ہے اور ابھی تک وہ واپس نہیں آیا۔"

"کیا مطلب۔ کیا رات اس کے گھر کی نگہ رانی پر کوئی نہیں تھا۔"

"میں خود نگہ رانی کر رہا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ گھر میں موجود تھا۔ پھر اس کے مکان کی جتیاں گل کر دی گئیں۔ اس کے بعد میں چندہ جس منٹ تک وہاں موجود رہا لیکن وہ گھر سے باہر نہ نکلا جس سے میں بھی سمجھا کہ وہ سوچکا ہے۔ لہذا میں وہاں سے چلا آیا۔ صبح سویرے ہی میں دوبارہ وہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس مکان میں جب مجھے بہت دیر تک زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو مجھے اندر جا کر دیکھنا پڑا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔"

"تم سے بڑی قلمی ہوئی طاہر۔ تمہیں وہیں رہنا چاہیے تھا۔" ساجد نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں اور سخت شرمندہ ہوں۔" طاہر کا سر شرم سے جھک گیا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی ہمارے پاس ایک ذریعہ اور ہے۔ ساجد تمہارا وہ

کا ٹیشیل ابھی تک نہیں آیا۔" انسپیکٹر جمشید نے کہا۔

"بس آج ہی ہوگا۔ میں نے اسے کمرے کا نمبر بتا دیا تھا۔"

"کون سا کا ٹیشیل سرا؟" سب انسپکٹر طاہر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کل ہم نے اس شخص کو سون لائٹ ہوٹل سے نکلنے دیکھا تھا جس نے انسپکٹر

جمشید کی جیب سے ٹرین میں بیوہ نکالا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب اس کے گھر تک کیا

تھا، پھر میں نے وہاں ایک کا ٹیشیل کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔"

"اوہ سمجھا۔"

"دیکھنا طاہر۔ شاید یہ وہی ہے۔" ساجد نے کہا اور طاہر اٹھ کر دروازہ کھولنے

لگا۔ کا ٹیشیل اندر داخل ہوا:

"کیا رپورٹ ہے۔"

"میں نے رات اس کا تعاقب کیا تھا۔"

"تو وہ گھر سے نکلا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"کس وقت۔" انسپیکٹر جمشید نے پوچھا۔

"پونے نو بجے۔"

"پھر؟"

"میں اس کے پیچھے چلا رہا۔ اچانک اس نے سڑک پر سے گزرتی ہوئی ایک خالی

ٹیکسی روک لی۔ وہ اس میں بیٹھ کر نکل گیا۔ انسو کہ عین وقت پر مجھے کوئی ٹیکسی منل سکی۔"

"لعنت ہے تم پر۔" ساجد نے غصے کے عالم میں کہا۔

"اس غریب پر بگڑنے کی کیا ضرورت۔ اس میں اس کا کیا قصور یہ ٹیکسی کے پیچھے

دوڑ تو نہیں سکتا تھا۔" انسپیکٹر جمشید نے ساجد سے کہا۔ پھر نرمی سے کا ٹیشیل سے بولے:

"اچھا کوئی بات نہیں۔ تم واپس اسی جگہ جاؤ۔ اس کے مکان کی نگرانی کرتے رہو۔ جو فنی وہ واپس آئے۔ ہمیں فون کر دینا۔ ہوٹل کا نمبر تم نیچے سے معلوم کر لو۔ گمرے کا نمبر تو تمہیں معلوم ہی ہے۔"

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"بس جاؤ۔"

کالٹینیل کے جانے کے بعد وہ طاہر کی طرف مڑے:

"فیکسی ڈرائیور کے مکان کی نگرانی پر کسی کو مقرر کر دیا ہے۔"

"جی ہاں!"

"معلوم ہوتا ہے۔ اچکوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" ساجد نے پوچھا۔

"یہی کہ کوئی ان کے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"انہیں کیسے معلوم ہو گیا۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ان کے پرزوں سے جو انہوں نے اپنے بیڈوں میں رکھ دیے تھے۔" انسپکٹر

جشید نے مسکرا کر کہا۔

"تو کیا۔ ابا جان ہم سے غلطی ہوئی۔" محمود نے شرمندہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بلکہ جو ہوا۔ اچھا ہی ہوا۔"

"ویسے ابا جان۔ آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"دو کیا؟"

"ان تینوں پرزوں کے علاوہ فیکسی ڈرائیور ایک اور ذریعے سے بھی ہوشیار

ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔"

"فیکسیوں کے مالک کی طرف۔ ہم نے اس سے فیکسی ڈرائیور کا پتا پوچھا تھا۔"

"اوہ!" انسپکٹر جشید چونک اٹھے۔ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ طاہر انور آدو

آدو فیکسیوں کے مالک کی نگرانی پر بھی لگا دو۔"

"جی بہتر!" طاہر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"اب ایک بات ثابت ہو جاتی ہے۔" انسپکٹر جشید نے اس کے جانے کے

بعد کہا۔

"اوہ وہ کیا؟" ساجد نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ شہر کے تمام اچکے رات کو نو بجے کے قریب کسی ایک جگہ ضرور اکٹھے

ہوتے ہیں۔"

"یہ بات کس بات سے ثابت ہوتی ہے۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم اچھے انسپکٹر ہو۔ جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے۔"

"اوہ۔ اب سمجھا۔ ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"ابا جان۔ میں بھی سمجھ گئی۔" فرزانہ بولی۔

"اور میں بھی۔" محمود بولا۔

فاروق کچھ نہ بولا تو انسپکٹر جشید اس کی طرف مڑے۔

"فاروق تم خاموش ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔"

"میں سمجھی نہیں مارتا۔ ان دونوں کی طرح۔ ورنہ میں جانتا ہوں۔ فیکسی

ڈرائیور اپنے گمرے پونے نو بجے نکلا تھا اور گاڑی والا اچکا بھی پونے نو بجے نکلا تھا۔"

فاروق نے براہ راست منہ کر کہا۔

"بہت خوب۔ کمال ہے۔" ساجد کے منہ سے نکلا۔

پھر تین دن گزر گئے۔ ٹیکسوں کے مالک کی نگرانی تین دنوں سے ہی ہو رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور اور گاڑی والا اپکا ابھی تک اپنے اپنے گھر نہیں لوٹے تھے اور ان دنوں میں دولت پور کے کسی شخص کی جیب بھی نہیں کافی گئی۔ ٹیکسیوں کا مالک بھی اپنے اڈے اور گھر کے علاوہ کہیں نہ گیا۔

اب انسپکٹر جمشید، مساجد اور تھیوں بچے حیران اور پریشان تھے کہ یہ کیا چکر ہے۔ اچکوں کو پکڑنے کے لیے انہوں نے جن دو آدمیوں کو تجویز کیا تھا، اب وہ غائب ہو گئے تھے۔

"آخر وہ غائب کہاں ہو گئے۔" مساجد کہہ رہا تھا۔

"اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ابا جان۔ ٹیکسیوں کے مالک کو نہ بھولیے۔" فرزانہ بولی۔

"تم تو بس اسی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔" فاروق نے جمل کر کہا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کس کے پیچھے پڑنا چاہئے۔ اور کون ایسا ہے، جس کے ذریعے سے اچکوں کو یہ معلوم ہوا کہ ہم ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے فرزانہ ٹھیک کہتی ہے۔" محمود نے فرزانہ کا ساتھ دیا۔

"فرزانہ کی رائے میں بھی ایک خرابی ہے۔" انسپکٹر جمشید جو ان کی باتیں بغور سن رہے تھے، بولے۔

"دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا، تمہارا خیال ٹھیک نہیں ہے۔"

"ابا جان نے یہ تو نہیں کہا۔" فرزانہ نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں فاروق۔ فرزانہ کا خیال بالکل ہی غلط نہیں کہا جاسکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید

بولے۔

"تو پھر اس کے خیال میں کیا خرابی ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

"سوال یہ ہے کہ ہم نے ٹیکسیوں کے مالک سے ٹیکسی ڈرائیور کا پتہ پوچھا تھا نا۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" مساجد بولا۔

"اور اسے اس کی وجہ بھی بتائی تھی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"پھر اسے گاڑی والے اچکے کے متعلق کیسے معلوم ہوا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اودہ۔ واقعی۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"نہیں! اگر فرزانہ کے خیال کی گاڑی بھی رک جاتی ہے۔"

"فرض کر لیجئے۔۔۔۔۔" فرزانہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بس، بس فرض نہ کرنا۔ ورنہ کام خراب کر دیں گی۔" فاروق نے اسے روکا۔

"ہاں! کیا فرض کریں۔" انسپکٹر جمشید نے دلچسپی لینے والے انداز میں کہا۔

"فرض کیجئے۔ ٹیکسوں کا مالک ہی اچکوں کا سردار ہے۔ دو سب تین روز پہلے

رات کو اسے پکڑے۔ انہوں نے اپنی اپنی کہانی اسے سنائی۔ پھر اچکوں کے سردار کو یہ یاد

آیا کہ ہم اس ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ فوراً بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی جان گیا کہ گاڑی والے اچکے کو بھی ہم ہی نگرانی تھے۔"

"زندہ باد۔ فرزانہ زندہ باد۔ اس سے زیادہ چال دار اندازہ لگایا ہی نہیں

جاسکتا۔ کیوں مساجد۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں۔"

"حیرت انگیز۔ فرزانہ کا ذہن واقعی بہت تیز ہے۔"

"جی ہاں۔ تلواری سے بھی تیز۔" فاروق نے جمل کر کہا۔

"جل گئے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"مجھے کیا پڑی ہے جلتے کی۔ جلتے کے لیے اور بہت سی چیزیں ہیں۔" اس نے

بدستور جل کر کہا۔

"مثلاً؟" فرزانہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"مثلاً کوئلہ۔ لکڑی۔ گیس۔"

"بس بس۔ کہیں سب کچھ نہ جلا بیٹھنا۔" محمود نے گھبرا کر کہا اور اس کے

انداز پر سب کو ہنسی آگئی۔

"لیکن معاملہ پھر الگ جاتا ہے۔" ساجد بولا۔

"وہ کیسے؟" محمود نے چونک کر پوچھا۔

"ٹینکیوں کے مالک کی نگرانی برائے رشتہ دن سے ہو رہی ہے۔ اگر وہاں پتکوں کا

مردار ہے تو رات کے وقت وہاں پتکوں کی میٹنگ میں کیوں نہیں گیا۔"

"احتیاط کے خیال سے۔"

"کیا مطلب؟"

"اسے معلوم ہے کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر کیا کیا جائے۔"

"نگرانی بدستور جاری رہے گی۔"

"بہت اچھا۔ ایسا ہی ہوگا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" ساجد اٹھ کھڑا ہوا۔

"ذرا ظاہر کو صبر سے پاس بھیج دینا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں۔ اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"اس سے کچھ معلوم کرنا ہے۔"

"اچھا۔" وہ دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ ظاہر دروازے پر نمودار ہوا۔

وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

☆☆☆

واپسی کا پروگرام

"تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ تمہیں تو ٹینکیوں کے اڈے کے آس پاس ہونا چاہئے تھا۔" ساجد کی پیشانی پر غلٹنیں ابھرا آئیں۔

"جی ہاں! میں وہیں سے آرہا ہوں۔ دراصل میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ تین دن سے یہ نگرانی ہو رہی ہے، اب تک تو کوئی خاص بات معلوم ہوئی نہیں۔ کیا نگرانی جاری رہے گی۔"

"ہاں۔ نگرانی بدستور جاری رہے گی کیوں جمشید۔ تم کیا کہتے ہو۔"

"بالکل۔ نگرانی ہر حال میں جاری رہے گی۔"

"بہت بہتر۔ پھر تو میں وہیں پہنچتا ہوں۔" ظاہر جانے کے لیے مڑا۔

"ذرا ٹھہرنا انسپکٹر۔ مجھے تم سے کچھ معلوم کرنا ہے۔"

"جی فرمائیے۔" ظاہر رک کر بولا۔

"میں نے تین دن پہلے تمہارا جو پرس تمہاری جیب میں سے نکالا تھا، کیا وہ تم

نے ہی میرے اٹھایا تھا۔"

"جی۔ جی نہیں تو۔ میں نے نہیں اٹھایا تھا۔"

"کھائ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا بات ہے؟" ساجد نے پوچھا۔

"وہ پرس کمرے سے غائب ہے۔ اچھا انسپکٹر۔ اگر وہ پرس کم نے نہیں اٹھایا تو پھر تم نے اپنا برس مجھ سے کیوں نہیں مانگا۔" انسپکٹر جمشید نے طاہر سے سوال کیا۔

"دراصل مجھے خیال نہیں رہا۔ ابھی آپ کے ذکر کرنے پر یاد آیا۔ دوسری بات یہ کہ اس میں کوئی بڑی رقم بھی نہیں تھی۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ شاید اس میں چار سو چالیس روپے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے یاد آ گیا۔ اتنے ہی تھے۔"

"خیر۔ میں اسے ایک بار پھر اپنے کمرے میں تلاش کروں گا اگر مل گیا تو صحتیں واپس کروں گا۔"

"شکریہ! طاہر نے کہا۔" کیا اب میں چا سکتا ہوں۔"

"ہاں ضرور!"

طاہر کمرے سے نکل گیا تو انسپکٹر جمشید بوئے۔

"تمہارا اسٹنٹ بہت چستہ آدمی ہے، مجھے بہت پسند ہے۔ مگر دو تین سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو شاید یہ تمہارے ساتھ نہیں تھا۔"

"ہاں۔ اس وقت راشد تھا۔ یہ تو ابھی چند ماہ پہلے ہی آیا ہے۔"

"بہت ذہین آدمی ہے۔"

"لیکن انسوس ہے ہم دونوں مل کر ایک ایسا بکلی نہیں چکڑ سکے۔" ساجد نے ہنس کر کہا۔

"دونوں کی بجائے تینوں کہو۔ کیونکہ اب میں بھی شامل ہو گیا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ابا جان۔ آپ ہمیں بھول رہے ہیں۔" فاروق نے شریعت انداز میں کہا۔

"تو پھر اب یہ کہا جائے گا کہ ہم چھ آدمی مل کر ایک ایسے کو بھی نہیں چکڑ سکے۔" فرزات نے نتیجہ نکالا۔

"تم نتیجہ نکالنے میں بڑی تیز ہو۔" محمود نے تعریف کی۔

"کہیں اس سے امتحان کا نتیجہ نہ نکلوا لیتا۔" فاروق ہنسا۔

"مجھے اور تمہیں بغیر کھٹکے قتل کروے گی۔"

"اور خود الجہرے میں قتل ہو جائے گی۔" محمود نے کہا۔

"دیکھو۔ دیکھو۔ الجہرے کا نام نہ لیتا۔ مجھے اس کے نام سے ہی چڑ ہے۔"

"جب کہ ہم الجہرے کے پرچے میں سو میں سے سو نمبر حاصل کرتے ہیں۔"

فاروق ہنسا۔

"اسی جگہ تو میں مارا کھا جاتی ہوں۔" فرزات نے مایوسی سے کہا۔

"بھئی تمہارے بچے بہت تیز ہیں۔" ساجد نے تعریف کی۔

"انگل۔ کوئی چیز کاٹنے کا ارادہ تو نہیں۔" فاروق نے کہا اور سب کھٹکھا کر

ہنس پڑا۔

☆ ☆

دو دن اور گزر گئے اور انہیں اچکوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ شہر میں کسی کی بیب نہیں کاٹی گئی۔ تنگ آ کر انسپکٹر جمشید نے اپنا نوٹہ نوٹوں سے بھرا اور بیب میں ڈال کر اسی طرح ہونٹوں سے نکلے کہ بنوہ بیب میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اور کسی بیب کترے کے لیے اسے نکال لیا۔ مشکل نہ تھا۔ سارا دن بیدل شہر بھر کی خاک چھانٹتے پھرے لیکن ان کے نوٹے کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگا۔ شام کو جب وہ واپس ہوئے پہنچے تو ان کے کمرے میں انسپکٹر ساجد اور طاہر موجود تھے۔ ان دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

"تم سارا دن کہاں غائب رہے۔" ساجد نے پوچھا۔

"بس پارہ کیا تھاؤں۔ میں اپنوں کو دعوت دیتا پھر اک آؤ اور میرا ہنڈہ نکالو۔ لیکن نہ جانے اس شہر کے جیب کسوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سارے کے سارے کئی دنوں کے لیے سو گئے ہوں یا پھر شہر چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔"

"مجھے بھی اسی پر حیرت ہے۔ پانچ دن سے کسی کی جیب نہیں کالی گئی۔"

"اب تو میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا۔" ساجد نے پوچھا۔

"شہر کے اچکے بے شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" دوپولے۔

"آخر کیوں؟" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ انہیں یہاں میری آمد کی اطلاع ہو گئی ہے۔ اب میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کسی کو اطلاع دے کر نہیں آئے، ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا اصل نام نہیں لکھوایا۔ پھر جیب کتروں کو خبر کیسے ہو سکتی ہے۔"

"بہر حال۔ میں اس کیس میں اپنی مکمل ناکامی کا اعتراف کرتا ہوں، اور اسی وقت واپس جا رہا ہوں۔۔۔ ویسے بھی میں ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا جو ختم ہو رہی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" ساجد ہی نہیں، محمود، فاروق، فرزاد، تنگم جمشید اور طاہر تک حیران رہ گئے۔

"ہاں ابھی۔ مجھے افسوس ہے۔ ویسے تم مطمئن رہو۔ اب جیب کتروں اس شہر سے رخصت ہو چکے ہیں۔"

"مگر تم اس طرح نہیں چا سکتے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ دو چار دن میرے ہاں

بھی رہو گے۔ میرے بیوی بچے ہر روز تم لوگوں کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں۔ پہلے تمہیں وہاں چل کر رہنا ہوگا۔"

"بھئی۔ وہ تو میں نے اس صورت میں کہا تھا، جب ایک دو دن میں جیب کتروں سے بچنے کے لیے جاتے۔ دراصل انہوں نے اپنی سرگرمیاں ہی بند کر دی ہیں۔ وہ ضرور یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بس اب ہمیں اجازت دو۔ اس وقت چار بجے ہیں۔ گاڑی چمکے جاتی ہے، دو گھنٹے میں ہمارے پاس۔ اتنی دیر میں ہمیں تیار بھی ہونا ہے اور ہوٹل کا حساب بھی بے باقی کرنا ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔" ساجد ضد پر اڑا ہوا تھا۔

"دیکھو مجبور نہ کرو۔ پرسوں مجھے دفتر میں حاضری دینی ہے۔ میں پھر کبھی بیوی بچوں کیساتھ آ کر تمہارے ہاں کچھ دن گزار کر جاؤں گا۔"

"پکا وعدہ رہا۔" ساجد مطمئن ہو کر بولا۔

"ہاں۔ بالکل۔ پکا۔"

"اچھا۔ اس وقت تو میں چلا ہوں کیونکہ تمہیں تیاری کرنی ہے۔ ٹھیک پونے دو گھنٹے کے بعد میں جیب لے کر پہنچ جاؤں گا۔ جیب میں انیشین تک چلیں گے۔"

"نہیں۔ تم جیب لے کر نہ آنا۔ ٹیکسی میں آنا یا پیدل۔" انسپکٹر جمشید نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیوں؟" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ جیب تمہیں سرکاری کاموں کے لیے دی گئی ہے نہ کہ ذاتی کاموں کے لیے۔ اسے صرف سرکاری کاموں کے سلسلے میں استعمال کیا کرو۔"

"اور۔ کیا تم اس حد تک ایمان دار ہو۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ساجد بھائی۔ یہ تو گھر میں ٹیلیفون تک نہیں لگواتے۔"
 "اچھا۔ حیرت ہے۔" ساجد اور طاہر آنکھوں میں حیرت لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابا جان۔ یہ کیا۔ آپ نے ایک دم واپسی کا پروگرام بنالیا۔" فرزاد نے ان کے باہر نکلنے ہی پوچھا۔

"اور کیا کریں بیٹی۔ مجبوری ہے۔ چھٹی ختم ہو رہی ہے اور جیب کٹر کوئی پکڑا نہیں گیا۔ ان حالات میں واپس نہ جاؤں تو کیا کروں۔ میرا خیال تھا کہ ایک آدھ دن میں ہی تمام جیب کٹروں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میرے اندازے نکلے ثابت ہوئے۔ جیب کٹرے معمولی ذہانت کے مجرم نہیں ہیں۔ یا پھر کوئی بہت ہی ذہین آدمی انھیں کنٹرول کر رہا ہے اس لیے میں ایک بھی جیب کٹرے کو گرفتار نہیں کر سکا۔ اب ہم واپس نہ جائیں تو کیا کریں۔ یہاں رہ کر فائدہ کیا۔"

"اخبار والے آپ کی ٹاکامی کو نمایاں سرخیوں میں چھاپیں گے۔" محمود

بولے۔

"کیوں۔ بھلا اخبار والے کیسے چھاپ سکتے ہیں۔ کسے معلوم ہے کہ میں یہاں آیا تھا۔"

"اوہ ہاں ایہ تو میں بھول ہی گیا۔"

"بس اب ہاتھ ختم۔ سامان باندھو سامان۔ ہمیں جانا بھی ہے۔"

ان حالات میں کسی کا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ مجبور تھے۔

☆☆☆

گاڑی کے ٹکٹ

ٹھیک پونے دو گھنٹے کے بعد ساجد ان کے کمرے میں داخل ہوا۔
 اس مرحلہ طاہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"کیا تم تیار ہو چکے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہم بالکل تیار ہیں۔ بس تمہارا انتظار تھا۔"

"تو چلو پھر۔ گاڑی میں صرف پندرہ منٹ کی دیر ہے۔"

وہ ہونٹ سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

"کیا تم اپنا ارادہ بدل نہیں سکتے۔" ساجد نے ٹیکسی میں پوچھا۔

"نہیں۔"

"آخر کیوں۔"

"کل میری آخری چھٹی ہے۔"

"چھٹی کا کیا ہے۔ بذریعہ تاریخی لی جاسکتی ہے۔" ساجد نے اعتراض کیا۔

"لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ وہاں بھی کئی کام مجھے انجام دینے

ہیں۔"

"لیکن پار۔۔۔۔۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یکا یک یہ اچکوں کو ہوا کیا۔"

ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈر گئے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تم ہے۔" ساجد بھی مسکرایا۔

"تو کیا تم سے ڈرے ہیں۔ تم تو یہاں پہلے سے موجود ہو۔"

"اگر تمہارے جانے کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔"

"بے فکر ہو۔ میں پھر آؤں گا اور اس مرتبہ اتنی خاموشی سے آؤں گا کہ میرے

سوا کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ تمہیں بھی نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں..... کیوں..... مجھے خبر کرنے میں کیا خرچ ہے۔"

"کیا پتا۔ جیب کتروں کے مردار تھی ہو۔"

ان کی اس بات پر ٹیکسی میں ایک ہنستہ گونجا:

"بہت خوب۔ ویسے مجھے تمہارے اس طرح جانے کا افسوس بہت ہے۔"

"اس میں افسوس کی کیا بات۔"

"کاش۔ جیب کتروں کے کھڑے جاتے۔"

"خدا کو یہی منظور تھا۔" انسپکٹر جمشید نے صابرو شا کر لہجے میں کہا۔

"میں ڈرتا ہوں۔ کہیں کل سے ہی وارداتیں شروع نہ ہو جائیں۔"

"پر واہ کرو۔"

"پر واہ کیسے نہ کروں۔ تم تو جا رہے ہو۔ کم از کم تمہارے آنے سے اتفاق ہو ہی

گیا تھا کہ جیب کتروں نے اپنی حرکتوں سے باز آ گئے تھے۔"

"وہ بازی رہیں گے، مجھے یقین ہے۔"

ٹیکسی اسٹیشن کے سامنے رکی اور وہ اتر پڑے۔

ساجد کلٹ لینے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ انسپکٹر جمشید نے اسے روک دیا:

"نہیں۔ کلٹ میں خود لوں گا۔"

"ارے۔ اس میں خرچ ہی کیا ہے۔"

"نہیں۔ تم بچوں کے پاس ٹھہرو۔" انہوں نے کہا اور جنگ کی کھڑکی کے

پاس چلے گئے۔ کلٹ لے کر واپس آئے اور سب پلیٹ فارم پر پہنچے۔ گاڑی تیار کھڑی

تھی۔ وہ سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ رش کم تھا اور اس ڈبے میں ان

کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

آخر گاڑی نے دل دی۔ جو ٹیپی گاڑی ریٹکٹے لگی انہوں نے ہاتھ ہلائے اور

اس وقت ساجد کی آنکھوں میں دو آنسو جھللا اٹھے۔

تینوں بچے اس تھے۔ انہیں انسپکٹر جمشید کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا لیکن

انہوں نے باپ کے سامنے زبان کھولنے کی تربیت نہیں پائی تھی۔ مجبور تھے اور خاموش

بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ہر چیز گھومتی ہوئی ان کی نظروں کے سامنے سے

غائب ہو رہی تھی۔

"تم خاموش ہو۔" آخر انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی۔" فاروق صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"تمہیں میرا اس طرح چلا آنا اچھا نہیں لگا۔ یہی بات ہے نا۔"

"جی۔ جی نہیں تو۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ یہی بات ہے۔"

"آپ ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور تم۔ بیگم۔ تم بھی تو کچھ بولو۔ تم بھی خاموش ہو۔"

"کیا بولوں۔ جب بچے ہی خوش نہیں ہیں۔"

"ارے بھئی اس میں اداس ہونے والی کوئی بات ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔"

"نہیں بابا جان۔ ہم اداس تو نہیں ہیں۔"

"تو پھر بولو۔ باتیں کرو۔ ہنسو۔ چکھو۔۔۔۔۔"

"فاروق اور محمود ہی کچھ چپ چاپ ہیں۔ میں تو بالکل خوش ہوں۔" فرزانہ

مسکرائی۔

"جی ہاں۔ تم تو سمجھی ادا اس ہو ہی نہیں سکتیں۔" فاروق نے جملے بننے انداز

میں کہا۔

"کیوں۔ ہو کیوں نہیں سکتی۔ کیا میں انسان نہیں ہوں۔"

"ارے! تم انسان ہو۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

انسپکٹر جشیڈان کے سوڈا کوید لے دیکھ کر خوش ہوئے۔

"ہاں الب آئے ہونا تم اپنے اصل راستے پر تہماری سبکی باتیں تو اچھی لگتی ہیں۔"

"اباجان۔! آخر جیب کتروں کو آپ کے متعلق کیسے معلوم ہو گیا۔"

"سوچو۔ ذہن پر زور دو۔"

"تو کیا آپ کو معلوم ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں بھی۔ میں تو جانتا ہوں۔" انسپکٹر جشیڈ مسکرائے۔

"لیکن دولت پور میں تو آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا۔"

"کیا فائدہ تھا۔ اچکے اور ہوشیار ہو جاتے۔"

"لیکن ہم تینوں اس بات کو کیوں نہیں سمجھ سکے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"اس کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" فاروق نے کہا۔

"وہ کیا۔" فرزانہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہم تینوں کے دماغوں میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"دیکھو۔ تم صرف اپنے دماغ کے متعلق کہہ سکتے ہو۔ ہم دونوں کے نہیں۔"

محمود نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اگر تم دونوں کے دماغوں میں بھوسہ نہیں بھرا ہے تو بتاؤ۔ اچکوں کو کیسے اباجان کی آمد کا پتا چل گیا۔"

"یہ بات تو واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تو پھر اس بات کو تسلیم کر لو۔ کہ دماغوں میں بھوسہ بھرا ہے۔"

"اچھا۔ تم مجبور کرتے ہو تو تسلیم کر لیتے ہیں۔" فرزانہ نے مسمی صورت بنا

کر کہا۔ جس پر سب کو ہنسی آ گئی۔

اچانک انسپکٹر جشیڈ نے اپنی جیب سے گاڑی کے ٹکٹ نکالے اور بولے۔

"بھئی یہ اپنا اپنا ٹکٹ لے لو۔"

"اپنے پاس ہی رکھیے اباجان۔ ہم کیا کریں۔"

"نہیں بھئی۔ تم اپنا اپنا ٹکٹ اپنے پاس رکھو۔" انہوں نے ان کو دیکھ ایک

ٹکٹ دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے حیران ہو کر ٹکٹ لے لیے۔ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ ٹکٹ ان کو دینے

کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اچانک محمود اپنی سیٹ سے اچھل پڑا۔

"کیوں۔ تمہیں پکھونے کا ٹا ہے۔" فاروق نے اس کا مذاق اڑایا لیکن اس

نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو حیران حیران نظروں سے ٹکٹ کو دیکھے

چار اٹھا۔

فاروق اور فرزانہ نے بھی اپنے اپنے ٹکٹ دیکھے اور پھر ان کی بھی وہی حالت

ہوئی۔ وہ دونوں بھی بری طرح اچھلے۔

اب تو نیگم جشیڈ بھی نہ رہ سکیں۔ ٹکٹ جو انہوں نے اپنے پرس میں رکھ لیا تھا،

نکال کر دیکھا، دوسرے ہی لمحے ان کا بھی وہی حال ہوا۔

داردائیں کرنا بند کر دیں۔ ایسی صورت میں ان کو پکڑنا مشکل ہو گیا تھا۔ اب میں ان کے خیال میں دولت پور سے چلا آیا ہوں۔ اس لیے وہ پھر سے اپنا کام پالو کر دیں گے۔" انہوں نے بتایا۔

"لیکن انہیں یہ کیسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم دولت پور سے جا چکے ہیں۔"

"جیسے میری آمد کا علم ہو گیا تھا۔" انسپکٹر جشید مسکرائے۔

"آپ ضرور ہم سے کچھ پچھا رہے ہیں۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہاں! اچھا تو میں بہت کچھ رہا ہوں۔"

"آخر آپ کا پروگرام کیا ہے۔" محمود نے پوچھا۔

"دولت پور جائیں گے، ابھی دوبارہ۔" انسپکٹر جشید مسکرائے۔

"دیرنی گڈ۔ یہ ہوئی ناپات۔ میں بھی حیران تھا کہ ابا جان اتنی آسانی سے ہار ماننے والے تو ہیں نہیں انہیں ہو کیا گیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا۔" فاروق بولا۔

"شکر ہے خدا کا۔ مجھے تو یہ کای بُری طرح کھٹک رہی تھی۔" فرزانہ بولی۔

"جی ہاں۔ مجھے بھی ڈر رہی تھی۔" محمود نے اس کی نقل اتاری۔

"اب سامان اٹھا لو۔ اسٹیشن آنے والا ہے۔"

"کیا ہم اس قصبے میں ٹھہریں گے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہاں ٹھہر کر کیا کریں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہی ایک گاڑی دوسری

طرف سے آئے گی۔ اس میں بیٹھ کر دولت پور جائیں گے۔"

"بہت خوب۔ اب آیا مزا۔"

اسی وقت گاڑی نے دسل دی اور آہستہ ہونے لگی، یہاں تک کہ ڈک مچی۔ یہ

کوئی قصبہ تھا۔ دو گاڑی سے اتر آئے اور پلیٹ فارم پر پڑے بیٹھ گئے۔

"تم بیٹھو۔ میں گھٹ لے آؤں۔" انسپکٹر جشید بولے۔

مجرم

وہ مختصر انداز میں آنکھیں پھاڑے انسپکٹر جشید کو دیکھے جا رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔" آخر انسپکٹر

جشید نے مسکرا کر کہا۔ ان کی مسکراہٹ میں حدود بچے شوخی رہی تھی۔

"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ابا جان۔" آخر محمود بولا۔

"ارے! تو پھر؟" انسپکٹر جشید نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"یہ تو دولت پور سے صرف اگلے اسٹیشن کے ہیں۔" فاروق بولا۔

"اور جو آنے والا ہے۔ اترنے کی تیاری کرو۔" انسپکٹر جشید مسکرائے۔

"ہم اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔" فرزانہ نے اُلجھ کر کہا۔

"اوہ! میں سمجھ گیا۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"کیا سمجھ گئے تم؟" فرزانہ نے حیران لہجہ میں پوچھا۔

"ہم واپس دولت پور جائیں گے۔"

"ابا جان۔ کیا فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"ہاں۔ اس کا خیال ٹھیک ہے۔"

"آخر یہ آپ کو سوچھی کیا۔" عظیم جشید بول پڑی۔

"بات صرف اتنی ہی ہے کہ چاکوں کو میری آمد کا پتا چل گیا تھا لہذا انہوں نے

پھر وہ منٹ بعد دولت پور جانے والی ایک گاڑی اسٹیشن پر آ کر رکی اور وہ اس میں سوار ہو گئے۔ ایک گھنٹے بعد ہی وہ بارہ دولت پور کے اسٹیشن پر اتر رہے تھے اور پھر ایک جگہس میں بیٹھے ایک ہوٹل کا رخ کر رہے تھے لیکن اس سرچیدان کا رخ مولن لاسٹ ہوٹل کی طرف نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ انہوں نے ناشتا بھی کمرے ہی میں منگوا دیا۔

"یہ بچے ہال میں کیوں نہ چلیں۔" محمود بولا۔

"تم تو بے وقوف ہوا جیسے بھلے۔" فاروق بول اٹھا۔

"اچھا۔ یہ کس بات سے ظاہر ہوا۔"

"یہ بچے جانے کے خیال سے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہمیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھنا ہو گا تاکہ انچکوں کو یہ پتا نہ چلے کہ ہم واپس آ چکے ہیں۔"

"فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے محمود۔۔۔۔۔"

"جی ہاں۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ غلط کہہ رہا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"لیکن کیا جان۔ انچکوں کو پکڑنے کے لیے ہمیں آخر باہر تو نکالنا ہی پڑے گا۔"

"غیر زائد بولی۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اچھے دو بارہ وارداتیں شروع کرتے ہیں یا نہیں۔"

"اگر انہوں نے دو چار دن تک کوئی حرکت نہ کی تو کیا ہم کمرے ہی میں بند رہیں گے۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں۔ اس صورت میں ہم اپنے چہروں میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لیں گے۔"

"مثلاً۔؟" فاروق نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ میں مونچھیں لگا لوں گا۔ اور تم تینوں کے چہرے میں تو کوئی خاص تبدیلی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تھوڑا بہت فرق ڈال دیا جائیگا۔"

"بہت خوب۔ اب آئے گا جاسوسی کا سزا۔" فاروق خوش ہو گیا۔

اسی طرح لڑتے جھگڑتے اور نوک جھونک کرتے شام ہو گئی۔ آخر انیسویں جنوری نے بھٹی کا شبنم دیا۔

"لیس سرا!" میرے نے اندر آ کر پوچھا۔

"بھئی ذرا شام کا اخبار تو لا دو۔" انہوں نے میرے کو پاؤں پر پکڑے کا سکہ دیتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر۔" میرا چلا گیا۔

"آپ اخبار کا کیا کریں گے۔" محمود نے پوچھا۔

"دیکھوں گا کہ پروگرام شروع ہو گیا ہے یا نہیں۔"

"جیب کتروں کا؟" فاروق بولا۔

"ہاں!"

اسی وقت میرا اخبار لیے اندر داخل ہوا اور میز پر ڈال کر چلا گیا، وہ سب ایک ساتھ اخبار پر جھک پڑے۔ پھر سرخی دیکھ کر چونک اٹھے۔ یہ دولت پور کا مقامی اخبار تھا۔ سرخی تھی۔

"سات دن کے بعد جیب کاٹنے کی وارداتیں پھر شروع ہو گئیں۔"

"آج سچ آدھیوں کے ہونے آڑا لیے گئے۔"

"لو بھئی۔ پروگرام شروع ہو گیا۔ اب ہمیں بھی آج سے ہی اپنا کام شروع کرنا پڑے گا۔"

"جی بہتر۔" تینوں اس طرف چل پڑے جس طرف ٹیکسی ڈرائیور تھا۔

ان کے جانے کے بعد وہ بھی وہاں سے چل پڑے اور ایک دوسری عمارت کے سامنے رُکے۔ جلد ہی وہاں سے بھی ایک آدمی نکلا۔ اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ شخص پیدل چلتا رہا۔ آخر تین منٹ تک چلنے کے بعد ایک عمارت کے سامنے رُکا۔ اسے رکھنے دیکھ کر انسپکٹر جمشید ایک عمارت کی اوٹ ہو گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت بلکی سی آواز آئی۔

"ابا جان اہم یہاں ہیں۔" وہ چونک کر مڑے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر تینوں دیوار سے لگے اندھیرے میں کھڑے تھے۔

"تو وہ بھی دو مکان میں گیا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ کون تھا۔ جس کے پیچھے آپ آئے ہیں۔" محمود نے کہا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ اس نے کوٹ کے کالر کھڑے کیے ہوئے تھے۔

"اُپچوں کا سردار!"

"کیا!" ان تینوں کے منہ سے یک وقت نکلا۔

☆☆☆

"اب کیا پروگرام ہے۔"

"تمہاری امی سیکلر ہیں گی اور ہم چاروں باہر چلیں گے۔"

"تو پھر چلے۔"

"ابھی نہیں۔ مغرب کے بعد۔"

مغرب کے بعد وہ ہوٹل سے باہر نکلے۔

"کہاں چلتا ہے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ آج ہم ان کا ٹھکانا معلوم کر کے رہیں گے۔"

انسپکٹر جمشید بولے۔ اس وقت ان کے چہرے پر مصنوعی مسکرائش لگی ہوئی تھیں۔ فاروق کے منہ پر دائیں طرف ایک سیاہ رنگ کا ابھرا ہوا غل بنا ہوا تھا۔ محمود کی ناک کی نوک پر ایک سیاہ رنگ کا دھبہ سا تھا اور فرزانہ کے گال پر زخم کا نشان تھا۔ ان معمولی تبدیلیوں سے وہ کافی بدلے بدلے نظر آ رہے تھے اور پہلی نظر میں پہچانے نہیں جاسکتے تھے۔

پیدل چلے ہوئے وہ ایک عمارت کے سامنے پہنچے۔

"اس کے دروازے پر نظر رکھنا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"یہاں کون رہتا ہے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"وہی ٹیکسی ڈرائیور۔ تم تینوں اس کا تعاقب کرو گے۔"

"اور آپ.....؟" محمود نے پوچھا۔

"میں بعد میں آؤں گا۔" ٹھیک ہونے کو بچے ٹیکسی ڈرائیور عمارت سے باہر

نکلا۔

"وہ باہر آ رہا ہے۔ ہوشیاری سے اس کا تعاقب کرو۔ اور یہ ٹیکسی میں جائے تو تم بھی کوئی ٹیکسی پکڑ لیتا۔"

انسپکٹر ساجد ایک بار پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ انسپکٹر حبیب
کے چاتے ہی جیب کاٹنے کی وار داتیں شروع ہو گئیں تھیں۔ کل سے اس کا پھرناک میں
دم آیا ہوا تھا۔ کل چھ آدمیوں کی جھینس کاٹ لی گئی تھیں اور آج بھی صبح سے لٹنے والے
آرہے ہیں۔ اس نے شہر میں سب انسپکٹر ظاہر اور تمام کانسٹیبلوں کو دوڑایا ہوا تھا۔ اس
وقت بھی وہ جہا بیٹھا تھا۔ صرف تھانے کے دروازے پر برا ٹکل بدست کا ٹیبل کھڑا تھا۔
اچانک ایک لڑکا تھانے میں داخل ہوا اور پھرے وار کو خاطر میں لائے بغیر
ابھر گھٹنے لگا:

۱۷۔ اے۔ کٹر حکمران ہے اور۔^{۱۸}

"انجیر۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"چلو بھاگو۔ یہ تھا کہ ہے۔ کوئی پرچون کی دوکان نہیں ہے۔"

"یہ تھا نہ ہے اسی لیے تو اندر جا رہا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔

"کیا مطلب۔ کون ہو تم۔"

"میرے پاس تمہارے تھامنے دار کے لیے ایک خط ہے۔"

"*一夫一妻*"

”ہرگز نہیں۔ خط دینے والے نے کہا تھا کہ صرف تمہارے دارکودوں نے

مجھے اس کام کے بدلے میں روپے بھی دیے تھے۔"

"خط مجھے دو..... میں اندر دیتا ہوں۔" پھر ے دار نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہوئے لگا لیکن پہرے دار نے

اسے پائو سے پکڑ لیا۔

□ **المشروع** □

"خط مجھے دو۔ ورنہ اندر بند کر دوں گا۔ یہ تین کہیں گا۔"

”خیر وار۔ مجھے بد تمیز نہ کہتا۔“ لڑکا غرایا۔

شور کی آواز ساجد کے کانوں میں پیچھا لگتی رہی۔

”کیا بات ہے“ اس نے اندر سے کہا۔

⁴¹ جناب۔ یہ ایک خط مہم آپ کے نام۔

”اندر لے آؤ۔“ سجاد نے کہا۔

لڑکے نے ہنس کر چہرے دار کی طرف دیکھا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے

شیل میٹر پر رکھ دیا اور واپس مڑنے لگا۔

”شہر و قریہ خط کھال سے لائے ہو.....“ مساجد نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ مجھے ایک راہ گم کرنے دیا تھا۔ اور یہاں پہنچانے کی تاکید کی تھی۔"

"اچھا! ٹھہرو..... میں دیکھ لوں۔ اس میں کیا لکھا ہے۔ شاید تم سے کچھ پوچھتے

کی ضرورت پڑے۔ "ساجد نے کہا، لہذا انہما کو چاک کیا اور اس میں سے ہرچہ نکال

کریٹے لگا تھا:

”اگر تم اچکوں کر پکڑنا چاہتے ہو تو برٹن روڈ کی گیارہویں عمارت کے پاس

آج رات لو بجے آ جاؤ۔ لیکن بالکل تنہا آنا..... اپنے علاوہ کسی دوسرے کو اس بات کی

ہوا بھی نہ لگنے دینا اور نہ ایک بھی ایچکا نکلس پکڑا جائے گا اور تم ساری عمر چھتاتے رہو

گے۔ یاد رکھنا کسی کو نہ بتانا۔"

"وہ آدمی کس قسم کا تھا۔ اس کا حلیہ بتا سکتے ہو۔" ساجد نے خط پڑھنے کے بعد لڑکے سے کہا۔

"جی۔ لمبا چوڑا سا تھا۔ سوٹ پہنے ہوئے۔"

"چہرہ کیسا تھا۔"

"اتنا تو مجھے یاد نہیں رہا۔ دراصل میں وہ بیان نہیں دے سکا تھا۔"

"اچھا! شکریہ۔ تم جاسکتے ہو۔"

لڑکا باہر آیا، جاتے جاتے سامنے مڑ کر پہرے دار کو دکھا اور شوخ انداز میں مسکرا کر بولا۔

"آداب عرض ہے۔" یہ کہہ کر وہ تقریباً بھاگتا ہوا ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ اور سیدھا ایک میز کی طرف بڑھا۔ یہاں انسپکٹر جمشید غفرانہ اور فاروق کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"کیوں..... مجھ..... دے آئے خط!" انسپکٹر جمشید نے اس لڑکے سے پوچھا جو دراصل محمود تھا۔

"جی ہاں۔"

"ساجد نے تمہیں پہچانا تو نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"بہت خوب۔"

☆☆

رات تاریک تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے ایسے میں برٹن روڈ کی عمارت نمبر گیارہ کے کمرے میں تمام اُنچکے جمع تھے۔ انکا استاد بھی اپنی کرسی پر اجماع تھا۔ وہ باری باری کھڑے ہو کر انے اپنے ہنروں کی تفصیل بتا رہے تھے۔

بٹوے اچھل رہے تھے، ان کا استاد پوچھ رہا تھا کہ اچانک ہال میں ایک تیز آواز گونجی:

"خبردار۔ اکوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ تم سب اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

وہ چونک اٹھے۔ ہال کے دروازے میں انسپکٹر ساجد پستول لیے کھڑا تھا۔ پستول کی تالی اٹھی ہوئی تھی۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

"بہت خوب۔ ہم دس گیارہ ہیں۔ اور تم تھا۔ انسپکٹر بہتر یہ ہے کہ تم اپنا پستول نیچے گرا دو۔" استاد نے مسکرا کر کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ میں تنہا ہوں۔"

"تو کیا اپنے ساتھ سکندر کی فوج لائے ہو۔" استاد نے ہنس کر کہا۔

"خاموش۔ ورنہ سب سے پہلے گولی تمہارے ہی سر میں گھسے گی۔"

"تم بھول رہے ہو۔ اب یہاں سے بچ کر نہیں جاسکتے۔ مگر میں حیران ہوں۔

تم اندر کیسے آئے۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار کہاں گیا۔"

"میں اسے گہری نیند سلا آیا ہوں۔ وہ تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔" ساجد مسکرایا۔

"اوہ! تم اسے بے ہوش کراؤ ہو۔"

"ہاں۔"

سودا کر لیا انسپکٹر۔ ہم آج کی ساری کمائی تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔" استاد نے ہار مان کر کہا۔

"میں جس کمائی پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"اچھا! میں تمہیں دس لاکھ روپے سکنا ہوں۔"

"خاموش رہو۔ مجھے ایسی کمائی نہیں چاہیے۔"

"تم دیکھو تو سہی۔ یہ دیکھو میری میز کی دراز میں کتنی دولت ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میز کی دراز کو کھول ڈالا۔

"خیر دار۔ میز پر سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

مگر اتنی دیر میں استاد پستول اٹھا کر قاز کر چکا تھا۔ گولی ساجد کے پستول پر لگی اور وہ اس کے ہاتھ سے اچھل کر زمین پر گرا جسے ایک اچکے نے دوڑ کر اٹھالیا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" استاد فرمایا۔

"ابھی نہیں۔" پیچھے سے ایک آواز آئی۔ وہ سب چونک کر مڑے۔ ایک لڑکی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی۔

"یہ کیا چکر ہے..... کون ہو تم۔"

"میں یہ گڑیا آپ کی خدمت میں پیش کرنے آئی ہوں۔" لڑکی بولی۔

"بکواس نہ کرو۔" استاد فرمایا۔

جی بہت بہتر۔"

اسی وقت لڑکی نے گڑیا کا پیٹ ہاتھ آگے بڑھا کر دبا دیا۔ اس میں سے دھوئیں کی ایک پتی سی لکیر نکلی اور سیدھی اچکوں کی طرف گئی۔ تین چار اچکوں کے منہ سے چپچپ نکلیں اور وہ فرش پر لڑھک گئے۔

"ارے۔ ارے۔ یہ کیا۔"

"اس گڑیا کے علاوہ بھی ہمارے پاس کچھ ہے۔" ایک اور آواز آئی۔ اس مرتبہ ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ حیرت کی وجہ سے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

"یہ دیکھئے..... یہ ایک پینل تراش ہے۔ یہ میں آپ لوگوں کے درمیان پھینکتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے پینل تراش اچکوں پر اچھال دیا۔ پینل تراش ہلکی آواز کے

ساتھ زمین سے لکرایا ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔ اس پینل تراش میں سے چکا چوند کر دینے والی روشنی نکلی جو ان کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔

"ارے مر گئے۔ اُف میری آنکھوں کو کیا ہوا۔" کئی اچکے اپنی آنکھوں کو پکڑ کر چلانے لگے۔ استاد حیرت کا بت بنا دیکھ رہا تھا۔

"آپ یہ چاکلیٹ کھائیے۔" ایک اور لڑکا اندر داخل ہو کر استاد سے بولا۔

ساتھ ہی اس نے ایک چاکلیٹ اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹا لیکن اتنی دیر میں چاکلیٹ کسی ننھے منے ہم کی طرح پھٹ چکا تھا۔

استاد کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔

"بہت خوب۔ اب تم ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" ایک لڑکا اندر داخل ہوا جس کے چہرے پر مونچھیں تھیں ہاتھ میں پستول۔ استاد کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ اس کے جو ساتھی ہوش میں تھے، ان کے ہاتھ بھی اوپر اٹھ گئے۔

ساجد حیرت کا بت بنا کھڑا تھا۔

"کھیل ختم ہو گیا۔ ساجد اب تم فوراً سپاہیوں کو فون کر کے بلاؤ۔"

"کون ہو تم۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"تمہارا دوست۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی مونچھیں اکھاڑ دیں۔

"ارے۔ جشید تم....."

"ہاں اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔"

"حیرت ہے۔"

"حیران بعد میں ہو لینا۔ پہلے فون کر آؤ۔"

"میں امی فون کر کے آتا ہوں۔"

استاد کون؟

ان سب کو جھٹکڑیاں لگائی جا چکی تھیں لیکن وہ سب ابھی تک اسی ہال میں تھے۔ تمام اچکے اب ہوش میں تھے۔ ساجد ابھی تک حیران تھا۔ یہ سب کچھ اس طرح آنا قافا میں ہوا تھا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔

"اور اب۔ انسپکٹر ساجد میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ تم ان اچکوں کو بند کر دیا ان کا اپار ڈال لو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔"

"میرے ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ خیر تمہیں سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی

سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ تم اچکوں کے سردار کو دیکھ رہے ہو۔ اسے پہچانتے ہو۔"

"نہیں۔" ساجد نے کہا۔

"تمہارا اسسٹنٹ کہاں ہے۔ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ وہ نہیں آیا۔"

"وہ نہیں ملا۔" "تمہارے میں بھی نہیں تھا۔ نہ گھر ملا۔"

"وہ مل بھی کیسے سکتا ہے۔ وہ تو یہاں موجود ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"جی ہاں۔ یہ رہے وہ حضرت۔" انسپکٹر جمشید نے استاد کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

"کیا! وہ ایک ساتھ چلائے۔"

"ہاں۔ اس کے چہرے سے عینک اتار دو۔ خود ہی دیکھ لو گے۔"

ساجد نے آگے بڑھ کر اس کی عینک کھینچ لی..... اور پھر وہ سب حیران رہ گئے۔ طاہران کے سامنے تھا۔

"اب یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اچکوں کو میری آمد کا کیسے پتا چل گیا تھا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اب۔ اب تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"ہاں۔ دراصل مجرم تو شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ اسے ہماری ہر بات کا پتا چلتا رہا ہے۔ جب میں نے دو اچکوں کی نگرانی شروع کرائی تو اس نے انہیں اس عمارت میں قید کر دیا۔ اور اس طرح ہمارے راستے بند ہو گئے۔ پھر بھی یہ مجھ سے ڈر گیا اور اس نے وارداتیں ہی رکوا دیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ایک دن ام مومن لائنٹ ہوٹل کے کمرے میں باتیں کر رہے تھے۔ جب تم اٹھ کر جانے لگے اور تم نے ایک دروازہ کھولا تو یہ دروازہ پر موجود تھا۔ تم اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ کیونکہ تم نے تو اس کی ڈیوٹی ٹیکسیوں کے اوپر لگا دی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔"

"اور پہلے دن۔ جب مومن لائنٹ ہوٹل میں اچکوں نے چھ سات لوگوں کی جھینس کا ٹیس تو یہ ہوٹل کے ماہر موجود تھا۔ جب اس کے ساتھی ہوٹل سے باہر نکل گئے تو یہ کانسیبلوں کو لے کر اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ خود ہی ان کو قید کر بھاگنے کے مواقع دیتا تھا تو اچکے پکڑے کیسے جاسکتے تھے۔ پھر ہمارے کمرے سے اپنا بیوہ اڑانے والا بھی یہی تھا۔"

"ہوں۔ اب سمجھا کہ کوئی اچکا پکڑا کیوں نہیں جاتا تھا، لیکن ایک بات سمجھ

میں نہیں آئی۔ تم کو تو میں نے گاڑی میں سوار کر دیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے گاڑی چلی بھی گئی تھی۔" ساجد نے پوچھا۔

"ہاں! لیکن ہم دولت پور سے اگلے اسٹیشن پر ہی اتر گئے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے۔

"بھئی تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ مگر۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں۔ یہ گڑباز۔ پشیل۔

تراش اور وہ چاکلیٹ نہیں آئے۔" ساجد نے ان تینوں کھلونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جواب پھر ان تینوں کے ہاتھوں میں تھے۔

"بھئی۔ میرے ایک دوست ہیں۔ پروفیسر داؤد۔۔۔۔۔"

"پروفیسر داؤد۔ یہ تو ہمارے ملک کے سائنسدان ہیں۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ وہ ان بچوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ ضد کر کے ان سے ایسی

چیزیں بنوا لیتے ہیں۔ وہ بھی ان کی خوشی کی خاطر بنا دیتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ یہ تینوں کھلونے حیرت انگیز ہیں۔"

"اچھا بھئی۔ اب تو ہمیں اجازت ہے نا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں۔ اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ کچھ دن ہمارے ہاں رہنا ہوگا۔"

"کیوں بچو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"جو انکل کا۔۔۔۔۔!" تینوں ایک ساتھ بولے، ساجد اور انسپکٹر جمشید ہنس

پڑے۔۔۔۔۔"

-----☆☆-----

اٹلانٹس
پبلیکیشنز

D-83 سائٹ۔ کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk